زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

ماہنامہ اشراق

ستمبر 2024ء

مدیر: سید منظور الحسن

اشراق آڈیو

مدیر آڈیو: محمد حسن الیاس

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

اشراق

ماہنامہ

جلد ۲ شمارہ ۹ ستمبر ۲۰۲۴ء صفر/ربیع الاول ۱۴۴۶ھ

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر

سید منظور الحسن

مدیر آڈیو اشراق: محمد حسن الیاس

معاون مدیر: شاہد محمود

مجلس تحریر:

ریحان احمد یوسفی، ڈاکٹر عمار خان ناصر، ڈاکٹر محمد عامر گزدر

ڈاکٹر عرفان شہزاد، محمد ذکوان ندوی، نعیم بلوچ

فہرست

شذرات

پاکستان میں مساجد کا انتظام—غامدی صاحب کا موقف — سید منظور الحسن — 3

شرک، کفر اور ارتداد کا استیصال—غامدی صاحب کا موقف — سید منظور الحسن — 5

قرآنیات

البیان: البقرہ 2: 177-188 (13) — جاوید احمد غامدی — 8

معارف نبوی

احادیث — جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس — 13

مقامات

دیدۂ صورت پرست ما ست — جاوید احمد غامدی — 15

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

دین و دانش

شق القمر: غامدی صاحب کا موقف (14) — سید منظور الحسن — 18

نقطۂ نظر

مبارک ثانی کیس کا فیصلہ: دیوبندی قیادت کے لیے قابل توجہ پہلو — ڈاکٹر عمار خان ناصر — 21

زوالِ آدمِ خاکی — محمد ذکوان ندوی — 29

عقلِ محض، واجب الوجود اور سنگولیریٹی — محمد دین جوہر — 33

احکام حجاب کی تفہیم میں نظم قرآن کی اہمیت (2) — سید محمد رضوان علی — 39

محتارات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کا مسئلہ — سید ابوالاعلیٰ مودودی — 45

سیر و سوانح

حیاتِ امین (13) — نعیم احمد بلوچ — 56

امام شافعی اور ان کا تجدیدی کارنامہ (1) — غطریف شہباز ندوی — 65

ادبیات

جرم ضعیفی — جاوید احمد غامدی — 70

مرقد شبلی پر — یورش اعظمی — 72

حالات و وقائع

پاکستان، امریکہ اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ (4) — محمد حسن الیاس / رانا معظم صفدر — 75

خبر نامہ ”المورد امریکہ“ — شاہد محمود — 80

سید منظور الحسن

پاکستان میں مساجد کا انتظام

غامدی صاحب کا موقف

جامع مسجد کے بارے میں غامدی صاحب کا موقف ہے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں جمعہ اور عیدین کی نمازوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ اِن نمازوں کا انتظام و انصرام چونکہ حکومت کی ذمہ داری ہے، اِس لیے اِن مساجد کے معاملات کو حکومت کے کنٹرول میں ہونا چاہیے۔ چنانچہ اُنھوں نے لکھا ہے:

”نماز جمعہ اور نماز عیدین کا اہتمام حکومت کرے گی۔ یہ نمازیں صرف اُنھی مقامات پر ادا کی جائیں گی جو حکومت کی طرف سے اُن کے لیے مقرر کر دیے جائیں گے۔ اِن کا منبر حکمرانوں کے لیے خاص ہو گا۔ وہ خود اِن نمازوں کا خطبہ دیں گے اور اِن کی امامت کریں گے یا اُن کی طرف سے اُن کا کوئی نمایندہ یہ ذمہ داری ادا کرے گا۔ ریاست کے حدود میں کوئی شخص اپنے طور پر اِن نمازوں کا اہتمام نہیں کر سکے گا۔“ (مقامات 206)

اِس سے واضح ہے کہ غامدی صاحب شریعت کی رو سے تین باتوں کو ضروری قرار دیتے ہیں:

اول یہ کہ جمعہ اور عیدین کی نمازوں کا اہتمام حکومت کی ذمہ داری ہے۔

دوم یہ کہ یہ نمازیں حکومت کے زیرِ انتظام جامع مساجد میں یا دیگر مقررہ مقامات ہی پر ادا ہونی چاہییں۔

سوم یہ کہ ان نمازوں میں خطبے کا فریضہ حکمران یا اُن کا نمایندہ انجام دے۔

جمعہ مصر جامع میں منعقد ہو گا اور اُس کا منبر حکمرانوں کے لیے خاص ہو گا، یہ فقط غامدی صاحب کا موقف نہیں ہے، امام ابو حنیفہ اور دیگر ائمۂ احناف اِسی موقف کے قائل ہیں۔ اُنھوں نے اِسے جمعے کے لازمی شرائط میں شامل کیا ہے۔ ائمۂ ثلاثہ تو اِس معاملے میں مختلف رائے رکھتے ہیں، مگر فقہ حنفی کا معلوم و معروف اور مسلمہ موقف یہی ہے۔ اِس بات کا اندازہ فقہ حنفی کے ایک جید عالم مولانا زاہد الراشدی کے درجِ ذیل اقتباس سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ اقتباس ''برصغیر کے فقہی اور اجتہادی رجحانات کا ایک جائزہ'' کے زیرِ عنوان اُن کے ایک مفصل مضمون سے اخذ کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''1857ء کے بعد ایک علمی مسئلہ یہ درپیش ہوا کہ حنفی فقہ میں جمعہ کی نماز اجتماعی طور پر ادا کرنے کے لیے یہ شرط ہے کہ امام حکومت کی طرف سے مقرر کردہ ہو، جب کہ دہلی کے اقتدار پر تاج برطانیہ کا قبضہ ہو جانے کے بعد کوئی مجاز حکومت موجود نہیں رہی تھی، جو امام و خطیب کا تقرر کر سکے یا جس کا باضابطہ نمائندہ نمازِ جمعہ میں خطبہ و امامت کا فریضہ سرانجام دے سکے تو اب نمازِ جمعہ کی ادائیگی کیسے ہو گی؟ اِس پر علماے کرام نے اجتماعی طور پر یہ راستہ اختیار کیا کہ کسی امام پر مسلمانوں کی اکثریت کی رضامندی کو اسلامی حکومت کی طرف سے تقرری کا قائم مقام قرار دیتے ہوئے اِس شرط میں لچک پیدا کی اور جمعۃ المبارک کو ساقط کرنے کے بجائے اُس کا تسلسل باقی رہنے دیا۔ یہ بلاشبہ ایک اجتہادی عمل تھا، جو 1857ء کے بعد سامنے آیا، جب کہ بعض حلقوں میں اِس صورت میں جمعہ کی ادائیگی کے ساتھ احتیاطاً ظہر کی نماز کی ادائیگی کو بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔''

(ماہنامہ الشریعہ، اکتوبر 2013ء)

سید منظور الحسن

شرک، کفر اور ارتداد کا استیصال

غامدی صاحب کا موقف

شرک، کفر، ارتداد کے بارے میں رائج مذہبی بیانیہ یہ ہے کہ اِن کا استیصال شریعت کا حکم ہے۔ اِس مقصد کے لیے وہ مسلمانوں سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ دنیا پر اسلام کے غلبے کے لیے سرگرم ہوں، دعوت و جہاد کا علم اٹھائیں اور اقوام عالم کی سرحدوں پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کریں کہ ''اسلام لاؤ، جزیہ دو یا لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' گویا دنیا کے غیر مسلم جو اِس بیانیے کی رو سے کافر اور مشرک ہیں، اگر اسلام قبول نہیں کرتے تو اُن کے لیے زندگی کی گنجایش صرف اِس صورت میں ہے کہ وہ مسلمان ریاست میں ذمی یا محکوم ہو کر رہنے کا فیصلہ کریں۔ مزید یہ کہ اگر کوئی مسلمان دین سے منحرف اور مرتد ہو کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرے تو اُسے محکوم ہو کر بھی زندہ رہنے کا حق نہیں ہے، شریعت میں اُس کے لیے موت کی سزا مقرر ہے، جو ہر حال میں اُس پر نافذ ہونی چاہیے۔

جناب جاوید احمد غامدی اِس موقف کو دین و شریعت کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اِس کی تائید میں پیش کیے جانے والے قرآن و حدیث کے نصوص اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے بعض اقدامات کا تعلق اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت سے ہے، اسلامی شریعت سے اِن کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارے جلیل القدر علما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

بہ حیثیتِ رسول بعض خصوصی ذمہ داریوں کی تعمیم کر کے یہ نقطۂ نظر مرتب کیا ہے اور کچھ ایسے احکام کو شریعت میں داخل کر دیا ہے، جو شریعت کا حصہ نہیں تھے۔ اُنھوں نے لکھا ہے:

''شرک، کفر اور ارتداد یقیناً سنگین جرائم ہیں، لیکن اِن کی سزا کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو نہیں دے سکتا۔ یہ خدا کا حق ہے۔ قیامت میں بھی اِن کی سزا وہی دے گا اور دنیا میں بھی، اگر کبھی چاہے تو وہی دیتا ہے۔ قیامت کا معاملہ اِس وقت موضوع بحث نہیں ہے۔ دنیا میں اِس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم میں اپنی عدالت کے ظہور کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو اُس کی طرف اپنا رسول بھیجتے ہیں۔ یہ رسول اُس قوم پر اتمام حجت کرتا ہے، یہاں تک کہ کسی کے پاس خدا کے حضور میں پیش کرنے کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔ اِس کے بعد خدا کا فیصلہ صادر ہوتا ہے اور جو لوگ اِس طرح اتمام حجت کے بعد بھی کفر و شرک پر اصرار کریں، اُنھیں اِسی دنیا میں سزا دی جاتی ہے۔ یہ ایک سنت الٰہی ہے جسے قرآن نے اِس طرح بیان فرمایا ہے کہ ''ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب اُن کا رسول آ جاتا ہے تو اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔'' (یونس: 47) اِس کی نوعیت بالکل وہی ہے جو اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی اور واقعۂ خضر میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ اِس کا عام انسانوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم جس طرح کسی غریب کی مدد کے لیے اُس کی اجازت کے بغیر اُس کی کشتی میں شگاف نہیں ڈال سکتے، کسی بچے کو والدین کا نافرمان دیکھ کر اُس کو قتل نہیں کر سکتے، اپنے کسی خواب کی بنیاد پر ابراہیم علیہ السلام کی طرح اپنے بیٹے کے گلے پر چھری نہیں رکھ سکتے، اُسی طرح کسی شخص کو اُس کے شرک، کفر یا ارتداد کی سزا بھی نہیں دے سکتے، الّا یہ کہ وحی آئے اور خدا اپنے کسی رسول کے ذریعے سے براہ راست اِس کا حکم دے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اِس کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے۔''

(مقامات 200)

چنانچہ اُن کے نزدیک شرک، کفر اور ارتداد کے حوالے سے قرآن و حدیث کے احکام کا تعلق زمانۂ رسالت کے مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ سے ہے، جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے براہِ راست انکار کی پاداش میں عذابِ الٰہی نازل کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کفر، شرک اور ارتداد کے مرتکبین اور دنیا کے باقی انسانوں سے اب اِن احکام کا کوئی تعلق

نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”منکرین حق کے خلاف جنگ اور اس کے نتیجے میں مفتوحین پر جزیہ عائد کر کے انھیں محکوم اور زیر دست بنا کر رکھنے کا حق اس کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی مفتوح کو محکوم بنا کر اُس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔“ (میزان 599)

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(13)

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

(یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ سے وفا کا حق مذہب کی کچھ رسمیں پوری کر دینے سے ادا ہو جاتا ہے۔ اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ کے ساتھ وفاداری صرف یہ نہیں کہ تم نے (نماز میں) اپنا رخ مشرق یا مغرب کی طرف کر لیا، بلکہ وفاداری تو اُن کی وفاداری ہے جو پورے دل سے اللہ کو مانیں اور قیامت کے دن کو مانیں اور اللہ کے فرشتوں کو مانیں اور اُس کی کتابوں کو مانیں اور اُس کے نبیوں کو مانیں اور مال کی محبت کے باوجود اُسے قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور مانگنے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾

والوں پر اور لوگوں کی گردنیں چھڑانے میں خرچ کریں، اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اور وفاداری تو اُن کی وفاداری ہے کہ جب عہد کر بیٹھیں تو اپنے اِس عہد کو پورا کرنے والے ہوں اور خاص کر اُن کی جو تنگی اور بیماری میں اور جنگ کے موقع پر ثابت قدم رہنے والے ہوں۔ یہی ہیں جو (اللہ کے ساتھ اپنے عہدِ وفا میں) سچے ہیں اور یہی ہیں جو فی الواقع پرہیز گار ہیں۔177

ایمان والو، (تم میں) جو لوگ قتل کر دیے جائیں، اُن کے مقدموں میں قصاص تم پر فرض کیا گیا ہے۔ اِس طرح کہ قاتل آزاد ہو تو اُس کے بدلے میں وہی آزاد، غلام ہو تو اُس کے بدلے میں وہی غلام، عورت ہو تو اُس کے بدلے میں وہی عورت۔ پھر جس کے لیے اُس کے بھائی کی طرف سے کچھ رعایت کی جائے (تو اُس کو تم قبول کر سکتے ہو، لیکن یہ قبول کر لی جائے) تو دستور کے مطابق اُس کی پیروی کی جائے گی اور جو کچھ بھی خون بہا ہو، وہ خوبی کے ساتھ اُسے ادا کر دیا جائے گا۔ یہ تمھارے پروردگار کی طرف سے ایک قسم کی رعایت اور تم پر اُس کی عنایت ہے۔ پھر اِس کے بعد جو زیادتی کرے تو اُس کے لیے (قیامت میں) دردناک سزا ہے——۔ اور تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے، عقل والو، تاکہ تم حدود الٰہی کی پابندی کرتے رہو۔178-179

(اِسی طرح مال کے نزاعات سے بچنے کے لیے) تم پر فرض کیا گیا ہے کہ تم میں سے جب کسی کی موت کا وقت آ پہنچے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو والدین اور قرابت مندوں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کرے۔ اللہ سے ڈرنے والوں پر یہ حق ہے۔ پھر جو اِس وصیت کو اِس کے سننے کے بعد

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

بدل ڈالے تو اِس کا گناہ اُن بدلنے والوں ہی پر ہو گا۔ (اُنھیں یاد رکھنا چاہیے کہ) یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ جس کو، البتہ کسی وصیت کرنے والے کی طرف سے جانب داری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو اور وہ اُن کے درمیان صلح کرا دے تو اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بے شک، اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ 182-180

(یہ اللہ کے حدود ہیں اور اِن کی پابندی وہی کر سکتے ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں، اِس لیے) ایمان والو، تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے، جس طرح تم سے پہلوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم اللہ سے ڈرنے والے بن جاؤ۔ یہ گنتی کے چند دن ہیں۔ اِس پر بھی جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کر لے۔ اور جو اِس کی طاقت رکھتے ہوں کہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو اُن پر ہر روزے کا بدلہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔ پھر جو شوق سے کوئی نیکی کرے تو یہ اُس کے لیے بہتر ہے، اور روزہ رکھ لو تو یہ تمھارے لیے اور بھی اچھا ہے، اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ 184-183

رمضان کا مہینا ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، لوگوں کے لیے سراسر ہدایت بنا کر اور نہایت واضح دلیلوں کی صورت میں جو (اپنی نوعیت کے لحاظ سے) رہنمائی بھی ہیں اور حق و باطل کا فیصلہ بھی۔ سو تم میں سے جو شخص اِس مہینے میں موجود ہو، اُسے چاہیے کہ اِس کے روزے رکھے۔ اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کر لے۔ (یہ رخصت اِس لیے دی گئی ہے کہ) اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے اور نہیں چاہتا کہ تمھارے ساتھ سختی کرے۔ اور (فدیے کی اجازت) اِس لیے (ختم کر دی گئی ہے) کہ تم روزوں کی تعداد پوری کرو، (اور جو خیر و برکت اُس

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

اُحِلَّ لَكُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآىِٕكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَیْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَكُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ ۚ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِی الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

میں چھپی ہوئی ہے، اُس سے محروم نہ رہو)۔ اور (اِس مقصد کے لیے رمضان کا مہینا) اِس لیے (خاص کیا گیا ہے) کہ (قرآن کی صورت میں) اللہ نے جو ہدایت تمھیں بخشی ہے، اُس پر اُس کی بڑائی کرو اور اِس لیے کہ تم اُس کے شکر گزار بنو۔185

اور میرے (کسی حکم کے) بارے میں، (اے پیغمبر)، جب میرے بندے تم سے کوئی سوال کریں تو (اُن سے کہہ دو کہ اِس وقت) میں اُن سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اُس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا اُن کو چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں تاکہ وہ صحیح راہ پر رہیں۔186

(تم پوچھنا چاہتے ہو تو لو ہم بتائے دیتے ہیں کہ) روزوں کی رات میں اپنی بیویوں کے پاس جانا تمھارے لیے جائز کیا گیا ہے۔ وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم اُن کے لیے لباس ہو۔ اللہ نے دیکھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے تو اُس نے تم پر عنایت فرمائی اور تم سے درگذر کیا۔ چنانچہ اب (بغیر کسی تردد کے) اپنی بیویوں کے پاس جاؤ اور (اِس کا) جو (نتیجہ) اللہ نے تمھارے لیے لکھ رکھا ہے، اُسے چاہو، اور کھاؤ پیو، یہاں تک کہ رات کی سیاہ دھاری سے فجر کی سفید دھاری تمھارے لیے بالکل نمایاں ہو جائے۔ پھر رات تک اپنا روزہ پورا کرو۔ اور ہاں، تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو تو رات کو بھی بیویوں کے پاس نہ جانا۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں، سو اِن کے قریب نہ جاؤ۔ اللہ اِسی طرح اپنی آیتیں لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔187

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

اور (اِسی تقویٰ کا تقاضا ہے کہ) تم آپس میں ناحق ایک دوسرے کے مال نہ کھاؤ اور اُسے حاکموں تک پہنچنے کا ذریعہ نہ بناؤ، اِس لیے کہ اِس طرح لوگوں کے مال کا کوئی حصہ تمھیں اُن کی حق تلفی کر کے کھانے کا موقع مل جائے، دراں حالیکہ تم (اِس حق تلفی کو) جانتے ہو۔188

[باقی]

ترجمہ و تحقیق: جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس

— 1 —

ابو قتادہ بیان کرتے ہیں کہ اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ نے فرمایا: اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، لہٰذا اُس میں بشارت ہوتی ہے۔ سو تم میں سے کوئی شخص جب ایسی چیز خواب میں دیکھے جو اُسے اچھی لگ رہی ہو تو اُس کا ذکر صرف اُسی سے کرے جو اُسے عزیز ہو۔ اِسی طرح برا خواب شیطان کی طرف سے ہے۔ چنانچہ تم میں سے کوئی شخص جب ایسی چیز خواب میں دیکھے جو اُسے بری لگ رہی ہو تو اُس کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ تاہم اٹھنے کے بعد شیطان کے شر سے پناہ مانگتے ہوئے تین مرتبہ اپنے بائیں جانب تھو تھو کر دے، اور مطمئن رہے، وہ اُس کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ (جامع معمر بن راشد، رقم 965)

—2 —

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خواب تین قسم کے ہوتے ہیں: اللہ کی طرف سے خوش خبری، نفس انسانی کے مکالمات اور شیطان کے ڈراوے۔ پھر تم میں سے کوئی اچھا خواب دیکھے تو اُسے، اگر چاہے تو بیان کر سکتا ہے، لیکن کوئی ایسا خواب دیکھے جو اُسے اچھا نہ لگے تو کسی سے بیان نہ کرے، بلکہ اٹھ کر نماز پڑھے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ، رقم 29917)

3

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (دروازے کا) پردہ اٹھایا تو لوگ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے صف بستہ تھے۔ آپ نے یہ دیکھا تو فرمایا: لوگو، نبوت کی بشارتوں میں سے اب سچے خواب ہی باقی رہ گئے ہیں۔ اِنھیں مسلمان خود بھی دیکھیں گے اور اُن کے لیے یہ دوسروں کو بھی دکھائے جائیں گے۔ خبردار رہو! مجھے رکوع اور سجدے کی حالت میں قرآن پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ سو جہاں تک رکوع کا تعلق ہے تو اُس میں اپنے پروردگار کی کبریائی بیان کرو، اور جہاں تک سجدے کا تعلق ہے تو اُس میں خوب دعا کیا کرو، اِس لیے کہ تمھاری دعاؤں کی قبولیت کے لیے یہ موقع بہت ہی موزوں ہے۔

(صحیح مسلم، رقم 743)

مقامات

جاوید احمد غامدی

دیدۂ صورت پرست ماست

یہ ربیع الاول کا مہینا ہے۔ اِس مہینے میں وہ ہستی عالم وجود میں آئی جسے خود عالم کے پروردگار نے رحمۃ للعٰلمین قرار دیا۔ جس کی پوشاک اور جس کی ران پر ابن مریم نے دیکھا کہ اُس کا ایک نام لکھا ہوا ہے: خداوندوں کا خداوند اور بادشاہوں کا بادشاہ؛ وہ جو قیامت تک کے لیے سرور عالم ہے؛ جس کا قلم روز مین کے سارے کناروں تک پھیلا ہوا ہے؛ جسے جوامع الکلم عطا ہوئے؛ جس کے لیے ساری زمین مسجد بنادی گئی؛ جس کی ہیبت سے کفر لرزہ براندام ہوا؛ جسے میزان عطا ہوئی اور اِس کے ساتھ لوہا بھی کہ وہ اِس کے ذریعے سے لوگوں پر خدا کی حجت پوری کر دے؛ جس پر نبوت ختم ہوئی؛ قرآن نازل ہوا اور جس کے بارے میں یہ فیصلہ لوح گیتی پر ثبت کر دیا گیا کہ صبح نشور تک اب خدا کی غیر متبدل ہدایت اُس کی لائی ہوئی کتاب کے سوا کسی اور جگہ سے نہیں مل سکتی۔

وہ ہستی اِسی مہینے میں منصۂ عالم پر جلوہ فرما ہوئی۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اُس کی نسبت سے یہ مہینا رشک دہر ہے اور جی چاہتا ہے کہ اِس کا ایک ایک لمحہ جشن مسرت میں بسر ہو، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ صدیق و فاروق، عثمان و حیدر اور بلال و بوذر نے، جن کی اِس ہستی سے محبت و عقیدت کا سرمایہ ہی اُن کا اثاث البیت تھا، نہ اِس ماہ کو ”ماہ جشن“ بنایا اور نہ اِس دن کو ”عید میلاد“ قرار دیا

جس کی صبح درخشاں میں یہ دعاے خلیل اور نوید مسیحا پہلوے آمنہ سے ہویدا ہوئی۔ وہ دنیا میں تھے تو یہ دن بارہا طلوع ہوا اور یہ مہینا بارہا آیا، مگر اُن کے شب و روز کا دریا اپنے راستے پر بہتا رہا۔ آسمان کی آنکھوں نے لمحہ بھر کے لیے بھی اُس میں کوئی تموج نہیں دیکھا۔ یاللعجب، یہ ماجرا کیا ہے؟

''یوم اقبال''، ''یوم جناح'' — اِس ہستی کے مقابلے میں یہ لوگ ہی کیا تھے، لیکن اِن کے مداح اگر اِن کے یوم پیدایش پر یہ اہتمام کر سکتے ہیں تو اِس داناے سبل، ختم الرسل، مولاے کل کے لیے کیوں نہیں، جس نے:

غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا

میں برسوں اِس خلجان میں مبتلا رہا، مگر للہ الحمد کہ بالآخر یہ عقدہ حل ہوا۔ حقیقت نمایاں ہوئی تو یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ ہمارے فکر کی ساری نارسائیاں در حقیقت ہمارے زاویۂ نگاہ سے پیدا ہوتی ہیں:

بر چہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ
جرم نگاہ دیدۂ صورت پرست ماست

بات دراصل یہ ہوئی کہ ہم نے اُسے سب سے بڑا تو مانا، مگر اُنھی شخصیتوں کے زمرے سے مانا جن سے ہم مانوس تھے اور وہ اِس زمرے کا شخص ہی نہ تھا۔ چنانچہ یہ اِسی کا نتیجہ تھا کہ زمین پر سارے دن اُس کے تھے، مگر ہمارے لیے وہ ایک خاص دن میں پیدا ہوا؛ وہ ہر مہینے کا ماہ تاباں تھا، مگر ہم نے اُسے جب دیکھا، ربیع الاول ہی کے مطلع پر دیکھا؛ تقویم خداوندی میں ہر سال اُسی کے نام سے معنون تھا، مگر ہماری تقویم میں اُس کا یوم ولادت 570 بعد مسیح ہوا:

جرم نگاہ دیدۂ صورت پرست ماست

ہم نے چاہا کہ ہم سمندر کو کنوئیں میں بند کریں، صحرا کو صحن میں اتاریں اور آسمان کو ردا بنائیں، لیکن وہ جو اُس کے ساتھی تھے — صدیق و فاروق، عثمان و حیدر، بلال و بوذر — اُنھوں نے سمندر کو سمندر، صحرا کو صحرا اور آسمان کو آسمان دیکھا، تب اُن پر واضح ہوا کہ وہ جس کی یاد کی شمعیں ہر دل میں فروزاں رہنی چاہییں اور جس کا نام جب دن پہلو بدلے، ہر مسجد کے مناروں سے بلند ہونا چاہیے، یہ اُس کی شان سے فروتر ہے کہ اُسے ایک یوم میلاد اور ایک ماہ ربیع الاول کی شخصیت بنایا جائے۔ وہ عزیز از جاں اور عزیز جہاں ایک دن اور ایک مہینے کی شخصیت نہیں ہو سکتا۔

وہ تو ہر دن، ہر مہینے اور ہر سال کی شخصیت ہے، اِس لیے نہ "عید میلاد النبی" نہ "جشن ربیع الاوّل"، بلکہ صبح دم، دن ڈھلے، 'لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ'، ایک ہی صدا اور ایک ہی نغمہ: 'أشهد أن لا إله إلّا الله، أشهد أن محمدًا رسول الله'۔

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں، لاالٰہ الا اللہ

[1990ء]

سید منظور الحسن

شق القمر

غامدی صاحب کا موقف

[محمد حسن الیاس کے ساتھ ایک مکالمے سے لیا گیا]

(14)

باب سوم

شق قمر کا واقعہ ـــــ احادیث و آثار کی روشنی میں

شق قمر کا واقعہ اصلاً قرآنِ مجید میں مذکور ہے۔ اُس نے اِس قسم کی نشانیوں کے پس منظر اور خاص اِس واقعے کی نوعیت اور غرض و غایت کو پوری صراحت سے واضح کیا ہے۔ چنانچہ اِس واقعے کی تشریح و تفصیل میں اُسی کے مندرجات کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ تاہم، اِس کا ذکر متعدد

صحابۂ کرام نے بھی کیا ہے۔ اِن میں حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت جبیر بن مطعم، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم نمایاں ہیں۔ اِن میں سے بعض عینی شاہد ہیں اور بعض نے اِسے دوسروں کی شہادت پر روایت کیا ہے۔ یہ روایات احادیث و آثار کی صورت میں بخاری، مسلم، ترمذی، احمد، ابو عوانہ، ابو داؤد طیالسی، عبد الرزاق، ابن جریر، بیہقی، طبرانی، ابن مردویہ اور ابو نعیم اصفہانی کے مجموعوں میں متعدد اور مختلف سندوں کے ساتھ منقول ہیں۔ اِن روایات کو راویوں کے مشاہدے کے اعتبار سے دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1۔ شق قمر کا مشاہدہ کرنے والے اصحاب کی روایات

2۔ شق قمر کا مشاہدہ نہ کرنے والے اصحاب کی روایات

ذیل میں اِسی ترتیب سے مذکورہ روایات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ البتہ، اِس کے مطالعے سے پہلے شق قمر کے زمانے کا تعین ضروری ہے۔

شق قمر کے وقوع کا زمانہ

شق قمر کا واقعہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہجرت سے پہلے رونما ہوا تھا۔ تاریخ و سیرت اور حدیث و تفسیر کے علما کا اِس پر اتفاق ہے۔ اُن کے اندازے کے مطابق یہ واقعہ ہجرت سے تقریباً پانچ سال پہلے مکہ مکرمہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں پیش آیا تھا۔ آپ اُس وقت منیٰ میں تھے۔ اِس موقع پر متعدد صحابۂ کرام اور کفارِ قریش نے اِس کا مشاہدہ کیا تھا۔

شارح بخاری حافظ ابنِ حجر عسقلانی ''فتح الباری'' میں انشقاق القمر کی روایتوں کے تحت لکھتے ہیں:

قال: انشقّ القمر بمكة يعني: أن الانشقاق كان وهم بمكة قبل أن يهاجروا إلى المدينة. (7/184)

''ایک روایت میں راوی (حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) نے بیان کیا ہے کہ شق قمر کا واقعہ مکہ میں رونما ہوا تھا۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ جب چاند دو ٹکڑے ہوا تو وہ مدینہ کی طرف ہجرت سے پہلے مکہ میں تھے۔''

”المواہب اللدنیہ“ میں علامہ احمد بن محمد قسطلانی نے لکھا ہے:

كان بمكة قبل الهجرة بنحو خمس سنين.(2/254)

”یہ واقعہ مکہ مکرمہ میں ہجرت سے تقریباً پانچ سال پہلے رونما ہوا۔“

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے بھی اِسی تاریخ کی تصریح کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”تمام روایات کو جمع کرنے سے اِس کی جو تفصیلات معلوم ہوتی ہیں، وہ یہ ہیں کہ یہ ہجرت سے تقریباً پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ قمری مہینے کی چودھویں شب تھی۔ چاند ابھی ابھی طلوع ہوا تھا۔ یکایک وہ پھٹا اور اُس کا ایک ٹکڑا سامنے کی پہاڑی کے ایک طرف اور دوسرا ٹکڑا دوسری طرف نظر آیا۔ یہ کیفیت بس ایک ہی لحظہ رہی اور پھر دونوں ٹکڑے باہم جڑ گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت منیٰ میں تشریف فرما تھے۔“ (تفہیم القرآن 5/229)

سید سلیمان ندوی نے بیان کیا ہے کہ یہ واقعہ کفارِ قریش کے لیے آخری نشانِ ہدایت تھا۔ اتنی بڑی نشانی کو دیکھ کر بھی جب قریش ایمان نہ لائے تو اللہ نے آپ کو حکم دیا کہ اب حجت تمام ہو گئی ہے، اِس لیے اِس قوم کو چھوڑ کر ہجرت کر جایئے۔ وہ لکھتے ہیں:

”ہدایت کی اِن نشانیوں میں کفارِ مکہ کے لیے سب سے آخری اور فیصلہ کن نشان شق قمر کا تھا، جس کے بعد آیاتِ ہلاکت کا آغاز ہونے والا تھا... ہجرت سے پہلے شق قمر کا نشان ظاہر ہوا اور اُس کو دیکھ کر بھی جب قریش کے رؤسا اسلام نہ لائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے ہجرت کا حکم ہوا اور ہلاکت کے عذاب کے نازل ہونے کا وقت قریب آ گیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں اسرارِ نبوت کے جو محرم تھے، وہ پہلے ہی سمجھ چکے تھے کہ یہ ہجرت قریش کی بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ مستدرک حاکم (جلد 3، ص: 7) اور مسند ابن حنبل (جلد 1، ص: 216) میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکلے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا (انا للہ) مکہ والوں نے اپنے پیغمبر کو نکال دیا، اب یہ ضرور ہلاک ہو جائیں گے، چنانچہ (أُذِنَ لِلَّذِيْنَ) والی قتال کی آیت نازل ہوئی۔“ (سیرت النبی 3/173-172)

[باقی]

ڈاکٹر عمار خان ناصر

مبارک ثانی کیس کا فیصلہ

دیوبندی قیادت کے لیے قابل توجہ پہلو

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحابِ فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

گذشتہ فروری میں سپریم کورٹ نے مبارک ثانی کیس کے حوالے سے اپنا فیصلہ جاری کیا تو مذہبی طبقے کے لیے یہ ایک بم پھٹنے جیسی صورت حال تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مذہبی طبقے نے آج تک احمدیوں کے بارے میں کی گئی قانون سازی سے متعلق ریاستی اور عدالتی زاویۂ نظر کو ٹھیک طور پر سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور عدلیہ کی مسلسل تصریحات کے باوجود اپنی من مانی قانونی تشریحات میں مصروف رہا۔ زیر بحث مقدمے میں نجی حدود میں مذہبی آزادیوں کے اصول کا اطلاق بظاہر ایک نئے معاملے، (یعنی احمدی کمیونٹی کے پیروکاروں کے لیے مذہبی لٹریچر کی اشاعت اور فراہمی) پر کیا گیا، لیکن یہ اصول عدالتی و قانونی سطح پر پہلے دن سے طے کر دیا گیا تھا۔ بہرحال مذہبی طبقے کے لیے عموماً اور دینی قیادت کے لیے خصوصاً اس صورت حال کی نوعیت ناگہانی آفت کی تھی اور دینی و سیاسی قیادت کا جو ابتدائی اور فوری رد عمل سامنے آیا، وہ جارحانہ اور

مقدمے کی تفصیلات سے بے خبری پر مبنی تھا۔

اس تناظر میں مذہبی طبقوں کے پاس اس کے سوا کوئی فوری آپشن نہیں تھا کہ وہ احتجاج اور مذمت اور سازشوں کی دہائی دینے کا راستہ اختیار کر کے اپنی ساکھ کو بچانے کی کوشش کریں۔ چنانچہ مارچ میں مقدمے پر نظر ثانی کی درخواست دائر ہونے کے بعد نچلی سطح کی قیادت، خصوصاً عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے رہنما مولانا اللہ وسایا صاحب نے چیف جسٹس اور ان کے سیکرٹری ڈاکٹر مشتاق احمد صاحب کے خلاف ایک منفی پراپیگنڈا مہم شروع کر دی اور فتوے بازی کا معروف اور آزمودہ اسلوب اختیار کرتے ہوئے عدالت پر دباؤ ڈالنے کی حکمت عملی اختیار کی۔ تاہم یہ حکمت عملی کامیاب نہیں ہوئی اور جولائی کے آخر میں نظر ثانی شدہ فیصلہ زیادہ تفصیل اور وضاحت کے ساتھ مذہبی موقف کے خلاف آ گیا۔

اس مرحلے پر مختلف دیوبندی تنظیموں نے شخصی الزام تراشی اور فتوے بازی کا پہلے سے بڑھ کر سنگین اسلوب اختیار کیا اور بعض دیوبندی تنظیموں کے ذمہ داران کی طرف سے یہ سرٹیفکیٹ تک جاری کر دیا گیا کہ چیف جسٹس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے محروم قرار پا چکے ہیں، جیسے یہ حضرات آپ کی طرف سے شفاعت کے امیدواروں کی اسکروٹنی پر مامور ہوں۔ نعوذ باللہ۔ تاہم صورت حال اس پہلو سے زیادہ سنگین ہو گئی کہ اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے لیے تحریک لبیک پاکستان اور اس کے ہم نوا عناصر بھی شامل ہو گئے اور چیف جسٹس کے قتل وارتداد کے فتوے جاری کر کے سارے معاملے کو اس رخ پر آگے بڑھانے کی کوشش کی جس پر سلمان تاثیر اور آسیہ کیس کو بڑھایا گیا تھا۔

اس ساری صورت حال میں اعلیٰ سطحی دیوبندی قیادت کے سامنے تین بڑے چیلنج تھے، جن سے اسے بہ یک وقت نبرد آزما ہونا تھا:

1۔ عدالت کے سامنے مذہبی موقف کی ترجمانی،

2۔ ذیلی تنظیمی جتھوں کی طرف سے گولہ باری کے ماحول میں ریاستی اداروں کے ساتھ افہام و تفہیم کا راستہ نکالنا، اور

3۔ اس پورے معاملے کو تحریک لبیک جیسے عناصر کے ہاتھوں ہائی جیک ہونے سے بچانا۔

چنانچہ دیوبندی قیادت نے قومی سطح پر مذہبی نقطۂ نظر کی ترجمانی کو تدریجاً اپنے ہاتھ میں لیا،

ایک نسبتاً متوازن موقف پیش کرنے کا اہتمام کیا اور الزام تراشی اور بدزبانی کے اسلوب پر غیر ذمہ دار عناصر کو مناسب انداز میں سرزنش کی۔ اس ضمن میں والد گرامی مولانا زاہد الراشدی کی طرف سے 29/ جون کو روزنامہ اسلام میں ”ریاست مدینہ کے کلمہ گو غیر مسلم شہری“ کے عنوان سے ایک اہم تحریر شائع ہوئی، جس میں سیرت نبوی سے استشہاد کرتے ہوئے مصلحت اور حکمت کے مختلف پہلو واضح کیے گئے اور یہ پیغام دیا گیا کہ ملک کی دینی قیادت اور ریاستی اداروں کو مصلحت کے ان پہلوؤں کا لحاظ رکھتے ہوئے باہمی مشاورت سے اس بحران کا حل ڈھونڈنا چاہیے۔ اسی بحث کے دوران میں والد گرامی کی طرف سے ”ایک تلخ تجربہ اور مشاہدہ“ کے عنوان سے درج ذیل تحریر بھی سوشل میڈیا پر شائع ہوئی:

”1974ء کی تحریک ختم نبوت کے دور کی بات ہے جب میں گوجرانوالہ شہر کی کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کا سیکرٹری جنرل تھا۔ کسی قصبہ میں تحریک ختم نبوت کے جلسہ کی اجازت لینے کے لیے ایک ذمہ دار دینی راہنما مجھے ساتھ لے کر اے سی گوجرانوالہ کے پاس گئے اور درخواست پیش کی۔ انھوں نے کچھ دیر تامل کا اظہار کیا تو درخواست دہندہ نے جھٹ سے کہہ دیا کہ آپ مرزائی تو نہیں ہیں؟ اے سی صاحب نے کہا، مولوی صاحب! مجھے یہ گالی نہ دو، میں اجازت دے دیتا ہوں۔ دفتر سے باہر نکلے تو میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ آپ نے یہ کیا کام کیا ہے؟ بولے کہ اس کے بغیر اجازت نہیں ملنا تھی۔ اس وقت تو میں نے اس کو ذاتی اور انفرادی مزاج سمجھ کر نظر انداز کر دیا، مگر نصف صدی کے مسلسل تجربہ اور مشاہدہ سے اندازہ ہو رہا ہے کہ بعض حلقوں میں اس کی شاید باقاعدہ ٹریننگ دی جاتی ہے جس کی وجہ سے یہ ”فن“ اب ایک تن آور درخت کی صورت میں پوری قوم کے لیے مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔ اللہ پاک ہم سب کے حال پر رحم فرمائیں۔ آمین ثم آمین“

سپریم کورٹ کے فیصلے پر مختلف مکاتب فکر کے ذمہ دار علما نے مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اور مفتی منیب الرحمٰن صاحب کی قیادت میں اپنا تفصیلی موقف پیش کیا، جو قانونی نکات اور مذہبی استدلالات، دونوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کے آخر میں بھی جذباتی اور غیر ذمہ دار عناصر کو یہ نصیحت کی گئی کہ:

”ہم بصد ادب علمائے کرام اور خطبائے عظام سے گزارش کرتے ہیں: ختم نبوت اسلام کا

ایک بنیادی عقیدہ ہے، اس پر ایمان لائے بغیر کوئی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا عدالتی فیصلے پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیں متانت، وقار اور اسلامی اخلاقیات کا پاس رکھنا چاہیے۔ تہذیب سے گری ہوئی گفتگو اور گالی گلوچ سے حاملین دین کے بارے میں منفی تاثر پیدا ہوتا ہے اور یہ ہمارے عظیم ترین مقصد کے لیے نقصان دہ ہے۔"

ان اقدامات سے افہام و تفہیم کے ماحول میں ریاستی اداروں کے ساتھ نتیجہ خیز مکالمے کا امکان پیدا ہوا اور مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 22/ اگست کو سپریم کورٹ میں فیصلے میں تصحیح کے حوالے سے وفاق کی درخواست کی سماعت کے موقع پر نمایاں ترین کردار مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور مفتی تقی عثمانی صاحب کا رہا۔ کسی قسم کی بدتمیزی یا تلخ کلامی سے کام لیے بغیر خوش اسلوبی سے دیوبندی قیادت نے عدالت کو اپنے نقطۂ نظر کے حق میں قائل کر لیا اور عدالت نے اپنے مختصر حکم نامے میں سابقہ فیصلوں کے متنازعہ پیراگراف حذف کرنے کا اعلان کر دیا۔

فیصلے کے بعد بہت سے قانون دان حضرات نے سپریم کورٹ کے فیصلے پر کئی تحفظات ظاہر کیے ہیں، جو تکنیکی طور پر درست ہوں گے، لیکن اس کا ایک پہلو، بلکہ بنیادی پہلو سیاسی بھی ہے۔ سیاسی زاویے سے دیکھا جائے تو ریاستی اداروں اور دیوبندی قیادت نے سمجھ داری اور سیاسی پختگی کے ساتھ صورت حال کو ایک بڑے خلفشار میں بدلنے سے بظاہر روک دیا ہے۔ یہ کہنا بھی درست ہو گا کہ دیوبندی قیادت کو جو تینوں چیلنجز درپیش تھے، وہ حالیہ قضیے کی حد تک ان سب سے بہ یک وقت نبرد آزما ہونے میں کامیاب رہی ہے۔

جہاں تک فیصلے کے قانونی مضمرات کا تعلق ہے تو مختصر حکم نامے میں چونکہ ان پیراگرافس کی تعیین نہیں کی گئی جو سابقہ فیصلوں سے حذف کیے گئے ہیں، اس لیے سر دست اس پر کوئی رائے زنی بھی نہیں کی جا سکتی۔ بعض چینلز پر جو متعین پیراگرافس ذکر کیے گئے ہیں، ان کا حکم نامے میں تصریحاً کوئی ذکر نہیں اور اس کو فی الحال ایک قیاس ہی کہا جا سکتا ہے جو ممکن ہے، درست ہو۔ لیکن حقیقی صورت حال تفصیلی فیصلہ سامنے آنے پر ہی واضح ہو گی اور تبھی یہ دیکھا جا سکے گا کہ حذف شدہ پیراگرافس کے بعد قانون کی مجموعی تعبیر کیا بنتی ہے اور کیا وہ اعلیٰ عدلیہ کی اب تک کی تعبیر سے مختلف ہے یا اس کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اگر عدالت میں

موجود ذمہ دار علما کو اعتماد میں لے کر فیصلہ کیا گیا ہے تو مذہبی حلقوں کے اس بڑے اعتراض کا ازالہ یقیناً کر دیا جائے گا کہ کچھ پیراگرافس سے قادیانیوں کو اپنے گھروں کے اندر مسلمانوں کو تبلیغ کی اجازت دینے کا تاثر ملتا ہے، جو ظاہر ہے، قانون کے خلاف ہے۔

البتہ اس مرحلے پر اعلیٰ سطحی دیوبندی قیادت کی توجہ بعض ضروری امور کی طرف مبذول کرانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

میں نے کچھ عرصہ پہلے اپنی ایک تحریر میں دیوبندی قیادت کی ایک خوبی اور صلاحیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا:

> ”کسی بھی طبقے کے لیے، معاشرے میں قائدانہ نوعیت کا کوئی کردار ادا کرنے کے لیے جن فکری و عملی اور مزاجی خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے، ان میں دوسرے طبقوں کے ساتھ، اختلاف کے باوجود، کسی نہ کسی سطح پر تعلق کو قائم رکھنے اور باہمی تعامل کے لیے ممکنہ مشترک بنیادوں کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی خصوصیت غالباً سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ دیوبندی مزاج میں یہ خصوصیت، جیسا کہ بیان کی گئی مثالوں سے واضح ہوتا ہے، بدرجۂ اتم موجود ہے اور دیوبندی روایت کو مذہبی فکر و عمل کے میدان میں حاصل امتیاز کے ایک بنیادی سبب کا درجہ رکھتی ہے۔“ (ماہنامہ الشریعہ، جنوری 2019ء)

اس ضمن میں 74ء کے آئینی فیصلے کے تناظر میں مولانا غلام غوث ہزاروی رحمہ اللہ کے ایک مختصر خط کا حوالہ دینا یہاں برمحل ہوگا، جو انھوں نے مولانا سمیع الحق مرحوم رحمہ اللہ کے استفسار کے جواب میں لکھا تھا اور ماہنامہ ”الحق“ کی خصوصی اشاعت میں شائع ہوا۔ مولانا نے اس میں قادیانی مسئلے کے حوالے سے دینی طبقوں کو تین بنیادی مشورے دیے تھے:

1۔ آئینی فیصلے کی صورت میں جو قدم اٹھایا گیا ہے، وہ کافی ہے، جس کا مطلب یہ تھا کہ اس معاملے میں ریاست پر غیر ضروری بوجھ ڈالتے چلے جانے سے گریز کرنا چاہیے۔

2۔ ریاست کے کارپرداز طبقات کو دینی واعتقادی بنیاد پر طعن و تشنیع اور فتوے بازی کا نشانہ بنانے سے اجتناب کیا جائے۔

3۔ اس مسئلے کو ”وجاہت“ کا مسئلہ بنانے کا راستہ اختیار نہ کیا جائے، جس سے ان کی مراد یہ تھی کہ اسے مذہبی سیاست کا موضوع بنا کر اپنی طاقت بڑھانے کی کوشش نہ کی جائے۔

خط کا متن حسب ذیل ہے:

”برادرم مولانا سمیع الحق صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ موصول ہوا۔ مرزائیت کا اللہ تعالیٰ نے خاتمہ کر دیا ہے۔ اب ان کا معاملہ دوسرے کافروں کی طرح ہے۔ یہ سکھ، پارسی، عیسائی اور ہندو کی طرح ہو چکے ہیں۔ نکاح وغیرہ کے مسائل حل ہو گئے۔ ہمارے ٹکٹ پر یہ ممبر نہیں بن سکیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ باقی مسائل کے بارے میں ہم کو امید رکھنی چاہیے کہ حل ہو جائیں گے۔ میں اس بات کے سخت خلاف ہوں کہ بعض خود غرض اور اقتدار پسند افراد کہتے پھرتے تھے کہ حکومت مرزائی ہو گئی ہے، مرزائی نواز ہے، یہ ٹال رہی ہے۔ میرے بھائی! یہ کافی ہے۔ باقی میں سمجھتا ہوں، مرزائیت کا مسئلہ ختم ہو گیا ہے۔ کم از کم اس مسئلے کو ہم اپنی وجاہت کا مسئلہ نہیں بنا سکتے۔ جیسے دینی ضرورت پیش آئے گی، کریں گے۔ اللہ تعالیٰ توفیق بخشے۔ فقط (18/اکتوبر 1974ء)“

یہ تینوں نصیحتیں بہت برمحل اور اہم تھیں، لیکن افسوس ہے کہ تینوں پر ہی دینی طبقات نے کوئی توجہ دینا مناسب نہیں سمجھا۔ صورت حال اس وجہ سے بھی بگڑتی چلی گئی ہے کہ اعلیٰ سطحی دینی قیادت کی توجہ مرکوز نہ رہنے سے ذیلی سطح کے تنظیمی اسٹرکچر اپنی حکمت عملی کے اہداف اور سرگرمیوں کا رخ متعین کرنے میں ایک طرح سے خود مختار ہوتے چلے گئے ہیں۔

اس مقدمے کے مختلف مراحل پر میں تسلسل سے اس پہلو کی طرف ذمہ دار دینی قیادت کو متوجہ کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ چنانچہ 25/اپریل کو سوشل میڈیا پر اپنی تحریر میں عرض کیا کہ:

”ختم نبوت اور توہین مذہب کے ایشوز بنیادی طور پر اکابر اور ذمہ دار اہل علم کی نگرانی اور گرفت سے نکل کر تنظیمی سطح کے مہم جوؤں کے ہاتھ میں آ گئے ہیں۔ گزشتہ کچھ عرصے سے مسلسل یہ ہو رہا ہے کہ اپنے طور پر کوئی نہ کوئی جتھہ کوئی قانونی یا عدالتی ”کارنامہ“ انجام دے کر داد سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے اور ذمہ دار فورمز یا شخصیات کو مجبوراً ان کے ساتھ کھڑا ہونا پڑتا ہے۔

پچھلے سال قادیانیوں کو اپنے گھروں میں قرآن کے نسخے رکھنے سے روکنے کی کوشش کو عدالت عظمیٰ نے غلط قرار دیا، وہ بھی ایسا ہی کیس تھا۔ ابھی جس کیس میں تفسیر صغیر کی تقسیم کو

جرم قرار دلانے کی کوشش کی گئی، اس کی نوعیت بھی یہی ہے۔ میں ذمہ داری سے بتا سکتا ہوں کہ جو جو اکابر اور بزرگان عدالتی فیصلے پر تنقید کرتے نظر آئے، ان میں سے کوئی بھی اس مقدمے اور اس کی تفصیلات سے پہلے واقف نہیں تھا۔ ... ذمہ دار قیادت سے گزارش ہے کہ وہ معاملات کو اپنے ہاتھ میں لیں اور ایسے اقدامات پر مشاورت کا کوئی فورم بنالیں تاکہ ہر چار چھ مہینے کے بعد پورے مذہبی طبقے کو کچھ افراد کی حماقتوں پر شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔"

سپریم کورٹ کی طرف سے نظر ثانی شدہ فیصلہ آنے سے پہلے، یکم جون کو سوشل میڈیا پر ایک تحریر میں، میں نے عرض کیا تھا کہ:

"عدالتیں کئی دفعہ سیاسی صورت حال کو بھی مد نظر رکھتی ہیں۔ اس لیے کسی نہ کسی انداز کی فیس سیونگ ہمارے خیال میں مذہبی طبقوں کو دینی چاہیے تاکہ ہار جیت کی لڑائی میں مشغول ہو جانے کے بجائے انھیں ذرا توقف کر کے پوری صورت حال پر غور کرنے کا موقع مل سکے۔ مذہبی طبقوں میں صورت حال کا درست ادراک رکھنے والا عنصر بھی بڑے پیمانے پر موجود ہے، لیکن جذباتیت اور تصادم کی فضا میں اس کے لیے کوئی کردار ادا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ میرے خیال میں اعلیٰ سطحی دیوبندی قیادت اس بحران میں کچھ افاقہ ہونے پر نچلی سطح کی "نیم خود مختار" تنظیموں کے لیے آیندہ کی حکمت عملی کا رخ طے کرنے اور کچھ قدغنین وغیرہ عائد کرنے میں کردار ادا کر سکتی ہے۔ اگر قیادت کو اس کی نزاکت یا سنگینی کا کچھ ادراک ہو تو امید ہے کہ اس نازک صورت حال سے، آگے بڑھنے کے کچھ مثبت راستے نکل آئیں گے۔ ان شاء اللہ"

ہمارے خیال میں مبارک ثانی کیس کے حالیہ تجربے کی روشنی میں اعلیٰ سطحی دینی قیادت کو اب سنجیدگی کے ساتھ اس پہلو کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

اس کے ساتھ مذہبی طبقات کے رویے اور طرز گفتگو میں اس امر واقعہ کا ادراک بھی جھلکنا چاہیے کہ ختم نبوت کے عقیدے پر تو تمام مسلمان متفق ہیں، لیکن منکرین ختم نبوت کے ساتھ سیاسی اور قانونی لحاظ سے کیا معاملہ کرنا ہے، اس میں ایک واضح اختلاف موجود ہے۔ مذہبی علما یا تنظیمیں اس معاملے کی یک طرفہ طور پر اجارہ دار بن کر ریاست اور معاشرے پر اپنا موقف مسلط نہیں کر سکتیں۔ اس میں ریاست بھی فریق ہے، مذہبی علما بھی "ایک" فریق ہیں، معاشرے کے دیگر طبقات بھی فریق ہیں اور ملک کے شہری اور ایک اقلیتی گروہ ہونے کی حیثیت سے خود احمدی

کمیونٹی بھی ایک فریق ہے۔ نزاع کے متوازن اور قابل عمل تصفیے میں ان سب فریقوں کے نقطۂ نظر کو اہمیت حاصل ہونی چاہیے۔

اس ضمن میں ہماری قومی تاریخ اور سیاست کا یہ سبق ہر وقت یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ خصوصاً 80ء کی دہائی سے مختلف اقسام کی سیاسی یا مذہبی ریڈیکلائزیشن کو فروغ دینا اور اس عمل کو اپنے اقتدار کے تسلسل کے لیے استعمال کرنا ہماری مقتدرہ کا ایک آزمودہ طریقہ ہے۔ مذہبی دائرے میں سنی، شیعہ، دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، جماعت اسلامی، سب کے سب طبقے کسی نہ کسی حوالے سے اس عمل سے گزر چکے ہیں اور ابھی امکانات محدود نہیں ہوئے۔ اس سارے عمل کی قیمت معاشرے کو دینی پڑتی ہے اور بعض صورتوں میں خود مقتدرہ بھی اس کی زد میں آتی ہے، لیکن وہ بھی مقصد کے لحاظ سے سازگار ہوتی ہے، یعنی جب تک کسی قوت کو استعمال کیا جا سکے، استعمال کیا جائے اور جب وہ حد سے کچھ متجاوز ہونے لگے تو ریاست کے تحفظ کے لیے مقتدرہ ہی نجات دہندہ کے طور پر موجود ہو۔

اس کی جو قیمت بہ طور ایک تہذیبی قوت کے، مذہب کو ادا کرنی پڑے گی، بلکہ یہ ادائیگی شروع ہو چکی ہے، وہ معاشرے کی سطح پر مذہب سے لاتعلقی یا الحاد اور ریاست کی سطح پر سیکولرائزیشن ہے۔ مذہب ایک غضب ناک قوت کی شکل میں متحرک ہو تو فہیم اور تعمیری سوچ رکھنے والے عناصر کے لیے اس میں کشش نہیں رہتی۔ جب ایک کے بعد دوسرا مذہبی طبقہ ریڈیکلائز ہو کر کسی نہ کسی عنوان سے اپنی من مانی ریاست اور معاشرے سے منوانے کو ریت بنا لے گا تو ریاست کی برداشت کا پیمانہ بھی آخر بھر جائے گا اور نتیجتاً سیکولرائزیشن کا بیانیہ قوت پکڑے گا۔

(بہ شکریہ: www. madrasadiscourses.org)

محمد ذکوان ندوی

زوالِ آدمِ خاکی

ایک انٹرنیشنل اسکول کے "اسپورٹس ڈے" میں شرکت کا موقع ملا۔ اسکول کی طرف سے میرے بچے ابراہیم نے بھی اِس مقابلے میں حصہ لیا۔ اِس پروگرام میں طلبہ کے والدین بھی بہ طور زائر شریک تھے۔ طلبہ جب میدانِ مقابلہ میں اترے، اُس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ننھے فرشتے آسمان سے اتر کر اسکول کے وسیع سبزہ زار میں دور تک صف بستہ کھڑے ہو گئے ہوں۔ "بچے جنت کے پھول ہیں" یہ منظر اِس قول کا ایک انتہائی حسین نمونہ پیش کر رہا تھا۔

اِن معصوم بچوں کو دیکھ کر دل بھر آیا اور بے تابانہ انداز میں زبان پر یہ دعا جاری ہو گئی: خدایا، ہم بے مایہ و کم زور ہیں، ہم اِن بچوں کی تربیت کا نازک کام نہیں کر سکتے۔ تو قادرِ مطلق اور 'فعّالٌ لما یرید' ہے۔ تو اِن کا تزکیہ و تربیت کر، تو اِنھیں اپنے سچے بندوں میں شامل فرما۔

اِس کے بعد طلبہ کے متعلق سوچتے ہوئے یہ خیال آیا کہ کیا طلبہ اور والدین کا معاملہ دو الگ الگ افراد کا معاملہ ہے؟ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ نہیں، طلبہ اور والدین کی کامیابی اور ناکامی دو الگ الگ افراد کی کامیابی اور ناکامی ہر گز نہیں، دونوں کا معاملہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم ملزوم جیسا ہے۔ دونوں کی کامیابی اور ناکامی گویا ایک ہی فرد کی کامیابی اور ناکامی کے ہم معنی ہے۔

ایک شخص اگر اِس معاملے پر غور کرے تو اِس میں خدا کی دریافت کا ایک عجیب راز چھپا ہوا ہے۔ اگر وہ اِس راز کو دریافت کر سکے تو اُس کے اندر دعا کا ایک طوفانی سیلاب امڈ آئے گا۔ وہ خدا سے پورے عجز و نیاز کے ساتھ کہے گا کہ خدایا، جب ماں اور بچے کی کامیابی اور ناکامی کا معاملہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتا، تو پھر تو جو میرا اور تمام ماؤں کا خالق اور مالک ہے، اُس کا معاملہ

اپنے اِس بندے سے الگ کیسے ہو سکتا ہے؟ خدایا، کیا تو دنیا اور آخرت میں ہماری ناکامی کا تحمل کر سکتا ہے؟ خدایا، کیا جب تیرے فرشتے تیرے اِس بندے کو اُس کی بے عملی اور نافرمانی کے سبب ابدی جہنم کے حوالے کر رہے ہوں گے، تو کیا تو اُس وقت اپنے اِس بندے کے معاملے سے غیر متعلق (indifferent) ہو کر چین سے بیٹھا یہ منظر دیکھتا رہے گا؟ خدایا، کیا اپنے اِس بندے کو جہنم کے بھڑکتے شعلوں کے درمیان دیکھ کر تو مجھ پر رحم نہیں فرمائے گا؟ خدایا، مجھے جہنم کی پستیوں میں بھٹکتا دیکھ کر تجھے عرش معلیٰ پر چین کس طرح آ سکتا ہے؟ خدایا، تو اپنے اِس بندے کے معاملے میں کس طرح غیر جانب دار ہو سکے گا!

اِس طوفانی کیفیت کے دوران مناجاتِ اقبال کے یہ کلمات میری زبان پر جاری ہو گئے:

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لا مکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب، لا مکاں تیرا ہے یا میرا
اُسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیوں کر؟
مجھے معلوم کیا، وہ رازداں تیرا ہے یا میرا
محمد بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں، تیرا ہے یا میرا
اِسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی، زیاں تیرا ہے یا میرا

(بال جبریل)

اِس معاملے پر غور کرتے ہوئے سمجھ میں آیا کہ جہنم کا عذاب صرف اُنھی لوگوں کے لیے مقدر ہے جو خدا کے خلاف سرکشی کا طریقہ اختیار کریں۔ جو اپنی کوتاہیوں پر نادم نہ ہوں، بلکہ نخوت اور رعونت میں مبتلا ہو کر سعادت کے بجاے خود اپنے لیے بدبختی کے راستے کا انتخاب کر لیں۔

قرآن میں اِس اہم ترین حقیقت کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: 'لایَصْلاھا إلّا الاشقیٰ' (اللیل 92: 51)، یعنی جہنم میں وہی داخل ہو گا جو بڑا ہی بدبخت ہو، جو کھلم کھلا تکذیب اور

روگردانی کا طریقہ اختیار کرے۔ اِسی حقیقت کو قرآن کے ایک دوسرے مقام پر اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: 'وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ' (الاعراف 36:7)، یعنی جو لوگ ہماری باتوں کو جھٹلائیں اور کبر و نخوت کے ساتھ اُس سے روگردانی کا طریقہ اختیار کریں، وہی جہنمی ہیں، اور وہ اِس جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔

خدا اِس معاملے میں کیا چاہتا ہے، درج ذیل آیت میں اُس پر بہت اچھی طرح روشنی ڈالی گئی ہے: 'مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا' (النساء 147:4)، یعنی خدا کے بندو، اگر تم شکر گزاری کا طریقہ اختیار کرو اور سچے مومن بن کر رہو تو اللہ تمھیں کس لیے عذاب دے گا؟ اللہ تو بڑا قبول کرنے والا اور ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی حقیقت کو اپنے انتہائی بلیغ اور خوب صورت پیغمبرانہ اسلوب میں ایک جگہ اِس طرح بیان فرمایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

عن أبي هريرة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: "كل أمتي يدخلون الجنة إلا من أبى"، قالوا: يا رسول الله، ومن يأبى؟ قال: "من أطاعني دخل الجنة، ومن عصاني، فقد أبى". (بخاری، رقم 7280)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کے تمام لوگ جنت میں جائیں گے، سوائے اُن لوگوں کے جنھوں نے انکار کیا۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ، انکار کون کرے گا؟ فرمایا: جو میری اطاعت کرے گا، وہ جنت میں داخل ہو گا اور جو میری نافرمانی کرے گا، اُس نے انکار کیا۔"

عن أبي أمامة الباهلي قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ألا، كلكم يدخل الجنة إلا من شرد على الله شراد البعير على أهله. (احمد، رقم 2226)

"حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: یاد رکھو، تم میں سے ہر شخص جنت میں داخل ہو گا، سوائے اُس آدمی کے جو اللہ کی اطاعت

سے اِس طرح بدک کر نکل جائے جیسے
اونٹ اپنے مالک سے بدک جاتا ہے۔"

اِس قولِ رسول میں 'إلّا من شرد علی اللّٰہ شراد البعیر' کے الفاظ بے حد اہم ہیں۔ یہ الفاظ زیر بحث موضوع سے متعلق ارشادِ رسول کی اصل منشا و معنویت کو واضح کر رہے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا کے خلاف بدکنے والے اونٹ (جانور) کی طرح بدک کر اُس کے مقابلے میں سرکشی کا طریقہ اختیار کر لیں۔ تاہم، جو اہل ایمان امید اور رَجا کے درمیان زندگی گزاریں، اللہ کی رحمت سے یقینی امید ہے کہ اللہ اُنھیں ضرور معاف فرما کر اپنی بخشش اور رحمت سے سرفراز کرے گا۔

خدا کا سچا دین انسانوں کے لیے دین رحمت ہے۔ وہ بندوں کے نام خدائے رحمان اور رحیم کا ایک خوب صورت تحفہ ہے، اِلاّ یہ کہ آدمی خود دین رحمت کو اپنے لیے دین زحمت بنانے پر کمربستہ ہو جائے۔ اِسی طرح زندگی کا ہر موقع خدا کی یاد کا ایک موقع (occasion) ہے، بشرطیکہ آدمی اپنے لیے اُس کو خدا کی یاد کے ایک زندہ موقع میں تبدیل کر سکے۔

محمد دین جوہر

عقلِ محض، واجب الوجود اور سنگولیریٹی

عہد جدیدیت میں انسان نے جو افکار اور اعمال پیدا کیے ہیں، ان میں عقل اور عقلیت کی حیثیت ہر لحاظ سے مرکزی ہے، اور عقلیت کا کوئی جدید تصور اور عمل تحریکِ تنویر کے تعینات سے باہر نہیں ہے۔ عقل کا تنویری تصور عقلِ محض کا ہے۔ عقلِ محض کے کارہائے نمایاں اس قدر محیرِ آدم ہیں کہ مسلمانوں نے ڈھنگ سے ابھی اس کا احاطہ بھی نہیں کیا ہے۔ بہ تدریج انسانی علم اور عمل کی اساسات عقلِ محض پر منتقل ہو چکی ہیں۔ جدید دنیا عقلِ محض کے کرشمات کا جلوہ ہے، اور اس عقل نے انسان کو بھی اندر باہر سے بالکل بدل کا کر رکھ دیا ہے۔

اس وقت ہمارے سامنے بہ طور مسلمان بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا ہم عقلِ محض کے متداول تصور کو قبول کر سکتے ہیں یا نہیں؟ یہ سوال اس لیے سامنے آتا ہے کہ روایت کے انہدام کے بعد، اور تجدد کے ظہور اور غلبے کے بعد مسلمانوں کی پیدا کردہ فکر اور ان کے ہر طرح کے علوم میں عقل کا کوئی مربوط تصور سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ تعلیم میں ان کو تدریسِ سائنس کی جس قدر ضرورت ہوتی ہے، وہ نقل لگا کر یا ریس سے اپنی درسی کتابوں میں بھر لیتے ہیں، اور عقلِ محض کا خوف اس قدر ہے کہ تالیفِ قلب کے لیے درسی کتابوں کے شروع میں کچھ قرآنی آیات درج کر دی جاتی ہیں۔ ان آیات کا سائنسی متون سے کیا تعلق ہے، یہ نہ لکھنے والوں کو پتا ہوتا ہے اور نہ پڑھانے والوں کو۔ ہمارے ہاں خوش فہمی یہ ہے کہ جس طرح آدمی کو کلمہ پڑھا کر مسلمان کیا جا سکتا ہے، اسی طرح علوم اور اداروں پر بھی کچھ آیات کا دم کر کے انھیں بھی ''مسلمان'' کیا جا سکتا

ہے۔ آخر کوئی یہ کس سے کہے کہ ایسا ہو نہیں سکتا۔

اس صورت حال میں یہ غلط فہمی بہت عام ہے کہ مسلمانوں کا اور کفار کا تصورِ عقل بھی مختلف ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ آدمی یہ کہے کہ مسلمانوں کی ٹانگیں سر پر ہوتی ہیں اور کافروں کی ٹانگیں دھڑ کے نیچے ہوتی ہیں۔ یا یہ کہ مسلمانوں کی کھوپڑی گول ہوتی ہے اور کافروں کی کھوپڑی چوکور ہوتی ہے۔ لیکن جب فزکس، کیمسٹری، بائیولوجی، کمپیوٹر یا طب پڑھانی ہو تو بھاگے بھاگے ادھر ہی جاتے ہیں۔ یہاں اس بات پر زور دینا ضروری ہے کہ دنیا کے سارے انسان جسم اور ملکاتِ شعور میں بالکل یکساں ہیں، لیکن مقاصدِ حیات میں، جو ارادی ہیں، لامحدود تنوع ہے، یعنی عقل میں سارے انسان ایک جیسے ہیں، اور مقاصدِ عقل اور مآل کار میں قطعی مختلف ہیں۔

گزارش ہے کہ جدید عہد میں مسلمان عقل کے جس تصور کو اختیار کر سکتے ہیں، وہ عقلِ محض ہی کا ہے۔ عقلِ محض کی علوم میں کارفرمائی سے عقلیت کے ایسے تصورات سامنے لائے جاسکتے ہیں جو مذہبی عقیدے کے مؤید ہوں۔ عقلِ محض وجودی موقف کے طور پر جن جن قضایا کو تسلیم کرتی ہے، ان کی نشان دہی کی جاسکتی ہے اور عقلی دلائل سے ہی ان کا توہم ہونا ثابت کیا جاسکتا ہے۔ مزید یہ کہ عقل اور اس کے زائیدہ علوم ہی ایسا دائرہ فراہم کرتے ہیں جو تمام انسانوں کے درمیان قابلِ اشتراک ہے۔ اگر مسلمان عقل کے کسی بین الانسان مشترک تصور سے لاتعلق رہتے ہیں تو وہ جدید دنیا کے کسی بھی شعبے میں شرکت کا امکان نہیں رکھتے۔ بہ طور مسلمان ہمیں عقلِ محض سے جو مسائل ہیں، ان سے نبرد آزما ہونے کا محل بھی یہی ہے، اور عقل تسلیم تک پہنچنے کا راستہ بھی یہیں سے نکلتا ہے۔ اور عقلِ محض کی شمولیت اور شراکت کے بغیر جدید مذہبی شعور کی تشکیل کا منصوبہ شروع ہی نہیں ہو سکتا۔ جدید مذہبی شعور اگر متمنی ہے کہ وہ عقل کے دائرۂ کار کو پہلے سے متعین کر دے یا کسی طرح کی تحدیدات کو خارج سے عقلِ محض پر وارد کر دے تو یہ نادانی کی حد تک پہنچی ہوئی خوش فہمی ہے۔ عقل محض اس قدر جسور ہے کہ مذہب کی شہر پناہ سے باہر اپنی دنیا آباد کرتی ہے اور جہاں پناہ بنتے ہی وہ مذہب کو شہر پناہ سمیت نگل جاتی ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ شہر پناہ کے دروازے کھول دیے جائیں اور عقلِ محض کے کارِ تعقل میں براہ راست شریک ہوا جائے اور عقل کا ہمارا جو بھی تصور ہے، اسے وہاں آزمایا جائے۔ اگر ہمارا خیال ہے کہ ہمارا تصورِ عقل الگ سے ہو اور بالکل انوکھا ہو جو صرف ہمارے لیے ہی کارآمد ہو تو یہ محالات میں

سے ہے، اور ہماری بہت گہری توہم پرستی کا سبب ہے۔ عقل اپنی تحدیدات یا عدم تحدیدات اپنے کارِ تعقل میں 'work out' کرتی ہے اور صرف یہی اس پر وارد ہوتی ہیں۔ عقل کی ناصحانہ تحدیدات کا علم میں کوئی گزر نہیں ہے۔

تحریکِ تنویر میں عقلِ محض (Pure Reason) سے مراد یہ ہے کہ عقل اپنے آپ میں، اپنے تمام تر ملکات کے ساتھ، بہ طور فاعل علمی اپنے اور اس پوری کائنات کے روبرو، اور اپنے طریقۂ کار سمیت۔ تنویری عقل جب توہمات، اسطوریات، روایات اور وحی سے اپنے آپ کو ارادتاً منقطع کر لیتی ہے تو عقلِ محض ہونے پر فائز المرام ہو جاتی ہے۔ عقلِ محض کی تشکیل اور کارفرمائی کے لیے ضروری ہے کہ وہ نفسی داعیات از قسم غضب اور شہوت سے بھی بالاتر ہو کر اپنے کام کو سامنے لائے۔ آگے چل کر تحریک تنویر کے آدرشوں میں رومانوی آرزوئیں بھی شامل ہو گئیں تو عقلِ محض کے اس تصور میں ایک 'heroism' بھی داخل ہو گیا اور جدید انسان ایک غیر معمولی جرأت کے ساتھ پوری کائنات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ آج کی دنیا جدید انسان کی اسی حیرت انگیز جرأت سے پیدا ہوئی ہے۔ رومانوی اثرات کی وجہ سے جدید علوم اور افکار و اعمال میں ایک دھارا 'apocalypse' کا شامل ہو گیا ہے، اور عقل محض کی پیدا کردہ جدید تہذیب کسی فرخندہ فرجامی سے بہرہ مند نہیں ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ عقلِ محض مبدا (origin) کے معاملے میں سائل ہے اور انجام (end) کے معاملے میں ہائل۔ گزارش یہ ہے کہ عقلِ محض کا تصور اگرچہ کانٹ کا مانجھا ہوا ہے، لیکن یہ ہر طرح کے علوم میں برابر جاری رہی ہے، اور جدید علم الکلام میں بھی یہی عقل کارفرما ہے۔

یہاں میں اس امر کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ عقلِ انسانی اپنے آپ کو کوئی بھی عنوان دے کر بھلے سائنس میں کام کرے، بھلے علم الکلام میں غیب و شہود کے قلابے ملائے، بھلے مابعد الطبیعات کے فلسفیانہ جھولے آسمانوں میں ٹانکتی پھرے، بھلے مسئلۂ خیر و شر کے روبرو ڈکراتی رہے، اس کا اصولِ کار ایک جیسا ہی رہتا ہے۔ ہمارا کلاسیکل علم الکلام بالکل ویسے ہی عقلی تھا، جیسے آج کی سائنس ہے، ایک انتہائی بنیادی فرق کے ساتھ کہ اول الذکر میں عقل نے علم کو تشبیہی نہیں ہونے دیا، جب کہ سائنس خشتِ اول سے ارادتاً تشبیہی علم ہے۔ "ارادتاً" کی یہ تخصیص علم الکلام پر بھی یکساں وارد کی جاسکتی ہے۔ اس سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ کارِ عقل منطقی اور مقاصدِ عقل

ارادی ہوتے ہیں۔ ارادی ہونے کی وجہ سے مقاصدِ عقل ”عقیدے“ (belief statement) سے حاصل ہوتے ہیں۔ علم الکلام یہ اصول اپنے عقیدے سے اخذ کرتا ہے، جو وحدت ہے اور وہ شعور اور اس کے حاصلات پر یکساں وارد ہوتا ہے۔

جدید علوم میں دو انتہائی بڑے اور بنیادی مسائل ہیں۔ شعور کے تناظر میں یہ وحدتِ اصول اور وحدتِ علوم کا ہے، جس کا اظہار فزکس میں 'unified theory' کی تلاش کے عنوان سے سب کے علم میں ہے، جس میں کامیابی مخدوش، بلکہ ناممکن ہے۔ جدید علوم کا دوسرا بڑا مسئلہ وجود کے تناظر میں مبدا (origin) کا ہے۔ وحدت (unity) اور مبدا (origin) کے یہ دو بڑے مسائل ایسے ہیں جو علوم کے اندر رہتے ہوئے لاینحل ہیں، یعنی یہ دونوں عقلِ محض کے حاصلات کے طور پر سامنے نہیں لائے جاسکتے، کیونکہ یہ دونوں مسائل عقلی نہیں ہیں، عقلِ محض کی وجودی ضرورت ہیں۔ یہ عقل اور علوم پر اور مباحث وجود میں صرف باہر سے داخل کیے جاسکتے ہیں۔ ان میں مبدا کا مسئلہ زیادہ بنیادی اور گہرا ہے، اس لیے جدید انسان نے اس کا جواب اپنے توہماتی 'belief statement' سے حاصل کیا ہے کہ مادہ اور حیات ازخود وجود میں آئے ہیں، اور شعور بھی مادی ہے۔ یہ جواب عقلی نہیں ہے، بلکہ سینہ زوری ہے۔ یہ وجودی موقف ہے اور یہ عقل سے حاصل نہیں ہوسکتا، بلکہ عقل کا رہنما ہے۔ عقیدہ بھلے جیسا بھی ہو، وہ شبستان وجود میں عقل کو راہ دیتا اور اس پر جما کے رکھتا ہے، بھلے وہ راہِ راست ہو بھلے کج۔ بگ بینگ اور نظریۂ ارتقا مادے اور حیات کے ازخود وجود میں آنے کے 'belief structures' ہیں، اور بالکل ہی غیر عقلی اور 'pathetic' ہیں۔ مذہبی عقیدہ انسان کی سرشاری کا باعث ہے اور اس کی 'becoming' کا زینہ ہے۔ بگ بینگ اور نظریۂ ارتقا وقت کی نئی تقویم قائم کرنے سے کسی حد تک 'plausible' ہوگئے ہیں، ورنہ یہ دونوں بدترین درجے کی توہم پرستی اور مشرکانہ دہریت 'paganism' ہیں۔ اول الذکر نے وقت کو کائناتی (cosmic) بنا کر، اور مؤخر الذکر نے وقت کو ارضیاتی (geological) بنا کر انسان اور اس کے تجربے سے لاتعلق کر دیا ہے۔ وقت اور فاصلے کے سائنسی پیمانے انسانی شعور کے لیے قطعی نامانوس اور بے معنی ہیں، کیونکہ وہ ان کے احتوا کے قابل ہی نہیں ہے۔ یہ محض ریاضیاتی رقوم ہیں جو قطعی مجرد ہیں، اور جن کو مساواتوں میں استعمال کر کے سائنسی التباس پیدا کیا جاتا ہے۔

سائمن ویل (Simone Weil) نے کوانٹم میکانکس کی دریافت کے بعد کہا تھا کہ ہمارے پاس سائنس ہوا کرتی تھی اور کوانٹم میکانکس کے بعد آج اس کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ سو سال ہونے کو آئے ہیں اور کوانٹم میکانکس کے کسی بھی ایک بڑے مسئلے کے حل کی طرف کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔ کہا جاتا ہے کہ کائناتی اور ذراتی اسکیل پر "قوانینِ" فطرت دھڑام ہو جاتے ہیں۔ ذراتی اسکیل پر مادی وجود جو مظاہر سامنے لا رہا ہے، ان کا "علم" ممکن نہیں رہا اور جب علم ہی ممکن نہیں رہا تو کسی قانونِ فطرت کی معلومیت کا امکان بھی نہ رہا۔ یہاں دو باتیں توجہ طلب ہیں کہ کانٹ کا یہ موقف کہ صرف مظاہر کا علم ممکن ہے، قائم نہ رہ سکا۔ اور دوسری بات یہ کہ انتہائے علم پر 'origin' کا وجودی موقف بھی عقلی طور پر ثابت نہ ہو سکا اور توہم بن گیا۔ معاملہ یہاں نہیں رکتا، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے کہ بگ بینگ سے ورا ایک 'all singularity' فرض کی جاتی ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ یاد رہے کہ امتیازاتِ وجود علم کی بنیاد ہیں اور 'all singularity' میں ایک ایسے وجود کو فرض کیا گیا ہے جس میں داخلی یا خارجی کسی قسم کے امتیازات نہیں ہیں، اور نہ اس کا کوئی علم ممکن ہے۔ جدید سائنس نے انسان کو شعور و وجود کے ویرانے میں لا کر اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے کہ کوئی عقیدہ باقی ہے اور نہ کوئی علم۔

مذہبی علم الکلام اور عرفان نے ان مسائل کا جس طرح سامنا کیا ہے، وہ غیر معمولی ہے۔ علم الکلام نے وجود کے مظہر کو موضوع بنایا اور واجب الوجود کی صورت میں اس کا جو حل پیش کیا، وہ عقل اور عقیدہ، دونوں کے لیے ثقہ اور 'fulfilling' ہے۔ واجب الوجود سے عرفانیات کا سفر شروع ہوتا ہے اور جو بہت ثقہ طور پر وجود کے ہر مرتبے پر علم کے اعتبارات قائم کرتا چلا جاتا ہے، اور وجود بسیط، یا غیب الغیب، یا ذاتِ بحت کے مرتبے میں سارے اعتبارات ختم ہو جاتے ہیں اور وہی مرتبہ منقطع الاشارات کا ہے۔ یہ وہ درجہ ہے جہاں ہر طرح کا علم ساقط ہو جاتا ہے۔ علم الکلام میں عقل واجب الوجود کا اثبات سلبی طور پر کرتی ہے اور عقلاً یہی ممکن ہے۔ واجب الوجود براہ راست عقل کے لیے 'نامعلوم' کے درجے میں ہے۔ فزکس میں شہود کے خاص مرتبے میں علم کا سفر انجام پذیر ہو جاتا ہے اور سارے 'laws of physics' ختم ہو جاتے ہیں، یعنی ان مظاہر کا کوئی عقلی علم ممکن نہیں رہتا۔ دوسری طرف 'all singularity' ایک مابعد الطبیعاتی مفروضے (وجودِ بسیط) کے طور پر فرض کی گئی ہے۔ درجۂ شہود میں ہی، مظاہر وجود کے روبرو،

عقل انسانی کی فعلیت کا انجام پذیر ہو جانا اور 'all singularity' کو ایک مابعد الطبیعاتی مفروضے کے طور پر قائم کرنا انسانی شعور کی 'archetypal functioning' کو ظاہر کرتا ہے۔ ان مسائل کو علم الکلام اور عرفانیات میں جس طرح زیر بحث لایا گیا ہے، عقل کی درست فعلیت وہی ہے۔

سید محمد رضوان علی

احکام حجاب کی تفہیم میں نظم قرآن کی اہمیت

(2)

سورہ کے مضمون سے واضح ہے کہ منافقین اس کے بعد بھی باز نہیں آئے۔ لہٰذا پہلے مرحلے میں ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو بلا ضرورت گھر سے باہر جانے سے روکا گیا اور دوسرے مرحلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں عام لوگوں کے آنے پر بھی پابندی لگادی گئی۔ نیز اگر کسی خاص وجہ سے عام افراد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں آنا پڑتا ہے تو اس کے بھی آداب مقرر کر دیے گئے۔ اس صورت میں صراحت فرمادی گئی کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے اگر کچھ مانگنا ہو تو لازم ہے کہ پردہ کے پیچھے سے مانگا جائے۔ یہ قاعدہ بھی مقرر کر دیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص ازواج مطہرات سے نکاح نہیں کر سکتا اور ان کو امہات المومنین کی حیثیت دے دی گئی۔ ازواج مطہرات کے جذبۂ ایثار کو سراہتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پابند کر دیا گیا کہ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کو طلاق دے کر ان کی جگہ کوئی دوسری بیوی نہیں لا سکتے۔ ارشاد فرمایا ہے:

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَ لَآ	”اِن کے بعد اب دوسری عورتیں
اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّ لَوْ	تمھارے لیے جائز نہیں ہیں اور نہ یہ جائز
اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ	ہے کہ اِن کی جگہ اور بیویاں لے آؤ،
يَمِيْنُكَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ	اگرچہ اُن کا حسن تمھیں کتنا ہی پسند ہو۔
رَّقِيْبًا. يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا	تمھاری لونڈیاں، البتہ مستثنیٰ ہیں۔ اور اللہ

تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ ۙ وَ لٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۫ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ؕ وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ ؕ ....

(الاحزاب 33:53-52)

ہر چیز پر نگران ہے۔(یہ منافقین اپنی شرارتوں سے باز نہیں آرہے، اِس لیے) ایمان والو، تم اب نبی کے گھروں میں نہ جایا کرو، الّا یہ کہ تم کو کسی کھانے پر آنے کی اجازت دی جائے، تب بھی اِس طرح کہ اُس کی تیاری کے منتظر نہ رہو۔ ہاں جب تم کو بلایا جائے تو (وقت کے وقت) داخل ہو، پھر جب کھانا کھالو تو منتشر ہو جاؤ اور باتوں میں لگے ہوئے بیٹھے نہ رہو۔ اِس سے پیغمبر کو اذیت ہوتی ہے، مگر وہ تمھارا لحاظ کرتے ہیں اور اللہ حق بات کہنے میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ اور تمھیں جب نبی کی بیویوں سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔ یہ تمھارے دلوں کے لیے بھی زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے اور اُن کے دلوں کے لیے بھی...‘‘

یہی پاکیزگی اور تزکیہ دین کا مقصود ہے،[1] جس کا ان آیات میں ذکر کیا گیا ہے۔ تاہم اس مقصد کے حصول میں احوال کے اختلاف سے بعض اوقات خصوصی پابندیاں بھی عائد کر دی جاتی ہیں۔ ازواج مطہرات کے معاملہ میں بھی یہی ہوا ہے۔ ان کو امت کی مائیں قرار دے دیا گیا تھا اور یہ فطرت پر مبنی حکم نہیں تھا، بلکہ ایک عقلی حکم تھا۔ اس حکم کا لازمی تقاضا تھا کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن تمام امت کو بہ منزلۂ اولاد سمجھیں اور تمام مسلمان بھی ان کے لیے اپنے دلوں میں وہی پاکیزہ جذبات رکھیں جو وہ اپنی سگی ماؤں کے لیے رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن

[1] ۔ الشمس 91:10-7۔

کے معاملے میں سخت پابندیاں عائد کی گئیں کہ اگر ان سے کچھ مانگنا بھی ہو تو بھی پردے کے پیچھے سے مانگا جائے تاکہ مسلمانوں کے دلوں میں ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں پاکیزگی اور عقیدت کے عقلی جذبات کو فطری جذبات کی طرح جاگزیں کیا جاسکے، یعنی ایک خصوصی درجے کی طہارت اور پاکیزگی اس سلسلے میں ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور مسلمان امت سے مطلوب تھی، جس کا عام مسلمان مرد و عورتوں کے معاملات میں تقاضا نہیں کیا گیا ہے۔

ابن عاشور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو دیے گئے حکم حجاب کی حکمتوں کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ووَراءَ هَذِهِ الحِكَمِ كُلِّها حِكْمَةٌ أُخْرى سامِيَةٌ وهي زِيادَةُ تَقْرِيرِ أُمُومَتِهِنَّ لِلْمُؤْمِنِينَ في قُلُوبِ المُؤْمِنِينَ الَّتِي هي أُمُومَةٌ جَعْلِيَّةٌ شَرْعِيَّةٌ. بِحَيْثُ إنَّ ذَلِكَ المَعْنى الجَعْلِيَّ الرُّوحِيَّ وهو كَوْنُهُنَّ أُمَّهاتِ المُؤْمِنِينَ يَرْتَدُّ ويَنْعَكِسُ إلى باطِنِ النَّفْسِ وتَنْقَطِعُ عَنْهُ الصُّوَرُ الذّاتِيَّةُ وهِيَ كَوْنُهُنَّ فُلانَةً أوْ فُلانَةً فَيُصْبِحْنَ غَيْرَ مُتَصَوَّراتٍ إلّا بِعُنْوانِ الأُمُومَةِ فَلا يَزالُ ذَلِكَ المَعْنى الرُّوحِيُّ يُنْمِي في النُّفُوسِ، ولا تَزالُ الصُّورَةُ الحِسِّيَّةُ تَتَضاءَلُ مِنَ القُوَّةِ المُدْرَكَةِ حَتّى يُصْبِحَ مَعْنى أُمَّهاتِ المُؤْمِنِينَ مَعْنًى قَرِيبًا في النُّفُوسِ مِن حَقائِقِ المُجَرَّداتِ كالمَلائِكَةِ، وهَذِهِ حِكْمَةٌ مِن حِكَمِ الحِجابِ	”مذکورہ تمام حکمتوں کے علاوہ ایک اور بڑی اعلیٰ حکمت یہ ملحوظ تھی کہ مسلمانوں کے دلوں میں ازواج نبی کے ماں ہونے کے تصور کو راسخ کر دیا جائے، جو دراصل شریعت کا قائم کردہ ایک مصنوعی رشتہ تھا۔ مقصود یہ تھا کہ ازواج نبی کے امہات ہونے کا تصور لوگوں کے دلوں میں رچ بس جائے اور وہ ازواج کو ان کی انفرادی شخصیت کے لحاظ سے دیکھنے کے بجائے کہ وہ فلاں اور فلاں ہیں، صرف اس نظر سے دیکھیں کہ وہ ان کی ماں ہیں۔ یوں یہ روحانی رشتہ دلوں میں مضبوط ہوتا چلا جائے اور ازواج کی حسی شکل وصورت لوگوں کے ذہنوں میں دھندلی ہوتی چلی جائے تا آنکہ ان کے دلوں میں امہات المومنین کا تصور اسی طرح ایک مجرد قسم کا تصور بن جائے، جس طرح فرشتوں کا

الَّذِی سَنَّهُ النَّاسُ لِمُلُوکِهِمْ فِی القِدَمِ لِیَکُونَ ذٰلِکَ أَدْخَلَ لِطَاعَتِهِمْ فِی نُفُوسِ الرَّعِیَّةِ.

(التحریر والتنویر 22/91)

ہوتا ہے۔ یہی حکمت حجاب کی اس قدیم رسم میں بھی ملحوظ ہے جو لوگوں نے اپنے بادشاہوں کے لیے مقرر کی تھی تاکہ ان کی رعیت کے دلوں میں ان کی اطاعت کا جذبہ زیادہ جاگزیں ہو جائے۔"[2]

اس کے بعد کی آیات سے واضح ہے کہ یہ منافقین ہی تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج سے نکاح کرنے کے خواہش مند تھے۔ قرآن نے تدریجاً اس پورے مضمون کو جو آیت تخیر سے شروع ہوا تھا، ان آیات میں کھول کر واضح کر دیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَمَا کَانَ لَکُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْکِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِیْمًا. اِنْ تُبْدُوْا شَیْـًٔا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ کَانَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا. لَا جُنَاحَ عَلَیْهِنَّ فِیْٓ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِیْنَ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدًا.

(الاحزاب 33:55-53)

"تمھارے لیے جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ اُس کے بعد تم اُس کی بیویوں سے کبھی نکاح کرو۔ اللہ کے نزدیک یہ بڑی سنگین بات ہے۔ تم کسی چیز کو ظاہر کرو یا اُس کو چھپاؤ، اللہ کے لیے برابر ہے، اِس لیے کہ اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ نبی کی بیویوں پر اپنے باپوں کے سامنے ہونے میں، البتہ کوئی گناہ نہیں ہے اور نہ اپنے بیٹوں کے، نہ اپنے بھائیوں کے، نہ اپنے بھتیجوں کے، نہ اپنے بھانجوں کے، نہ اپنے میل جول کی عورتوں کے اور نہ اپنے غلاموں کے سامنے ہونے میں کوئی گناہ

---

[2]۔ ابن عاشور کی تحریر کا ترجمہ ڈاکٹر عمار خان ناصر کے مضمون "قرآن مجید میں مرد و زن کے احکام" کی قسط نمبر 6 سے لیا گیا ہے، جس کا تفصیلی حوالہ مقالہ کے آخر میں درج ہے۔

ہے۔ تم اللہ سے ڈرتی رہو، (بیبیو)۔ بے
شک، اللہ ہر چیز پر نگاہ رکھنے والا ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں عام افراد کے داخلے کی ممانعت کو بیان کرتے ہوئے غامدی صاحب لکھتے ہیں:

'' مطلب یہ ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں اب یہی لوگ بے تکلفی کے ساتھ داخل ہو سکیں گے یا جو اِن کے حکم میں ہوں گے۔ باقی سب لوگوں کے لیے آپ کی بیویاں اب حجاب میں رہیں گی۔ پیغمبر کے دشمنوں اور منافقین نے جو صورت حال پیدا کر دی ہے، اُس میں یہ پابندی ضروری ہے اور یہ پوری خدا ترسی اور تقویٰ کے ساتھ ہونی چاہیے، اِس سے محض خانہ پری مقصود نہیں ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ لوگوں سے حجاب میں رہنے کا یہ حکم ایک خصوصی حکم ہے جو منافقین کی پیدا کردہ ایک خاص صورت حال میں اُن کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو دیا گیا تاکہ پیغمبر کا گھرانا کسی اسکینڈل کی زد میں نہ آجائے۔ اِس کا عام عورتوں اور عام حالات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''(البیان 4/160)

ایسے حالات میں جب منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے گھرانے کو ہدف بنا رہے تھے، مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجیں اور ان پر رحمتوں کے نزول کی دعا فرمائیں۔ اس کے ساتھ منافقین کو دردناک عذاب کی وعید سنائی اور یہ بھی واضح فرمادیا کہ یہ منافقین صرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے کو نہیں، بلکہ عام مسلمانوں کو بھی ہدف بنا کر ان پر تہمتیں لگا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آگے جو حکم دیا ہے، اس میں ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ عام مسلمان خواتین کو بھی شامل کر لیا ہے۔ تاہم، ازواج مطہرات جیسے خطرات کا ان کو سامنا نہیں تھا، اس لیے پیچھے جو احکام دیے گئے ہیں، اس میں انھیں شامل نہیں کیا گیا۔[3] ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى ''(یہ منافقین نہیں جانتے)۔ حقیقت یہ

---

[3]۔ البیان 4/162

النَّبِیِّ ؕ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا. اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِیْنًا. وَالَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَیْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِیْنًا.

(الاحزاب 33:58-56)

ہے کہ اللہ اور اُس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیج رہے ہیں۔ ایمان والو، (تمھارے لیے بھی صحیح رویہ یہ ہے کہ) تم بھی اُن پر درود و سلام بھیجو۔ اللہ اور اُس کے رسول کو جو لوگ اذیت پہنچا رہے ہیں، اُن پر اللہ نے دنیا اور آخرت، دونوں میں لعنت کر دی ہے اور اُن کے لیے اُس نے رسوا کر دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو (اِسی طرح اُن پر تہمتیں لگا کر)، بغیر اِس کے کہ اُنھوں نے کچھ کیا ہو، اذیت دے رہے ہیں، اُنھیں بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اُنھوں نے بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اپنے سر لے لیا ہے۔‘‘

[باقی]

سید ابو الاعلیٰ مودودی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کا مسئلہ

[”رسائل و مسائل“ سے انتخاب]

سوال: باغ فدک کے مسئلے پر آپ کی تحقیق کیا ہے؟ اس کو اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے جیسے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر ظلم کیا گیا۔ کیا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث میں سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حق نہ دینا خلیفہ اوّل و دوم کے لیے درست تھا؟

جواب: باغ فدک کے مسئلے پر بحث کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وفات کے وقت کوئی ذاتی جائداد تھی بھی کہ اس میں سے میراث جاری ہوتی؟ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ نبوت کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام وقت دعوت حق کے کام پر صرف ہونے لگا تھا اور کاروبار تجارت بند ہو چکا تھا۔ مکہ معظمہ میں جب تک قیام رہا، اس اثاثے پر گزر بسر ہوتی رہی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہلے کا بچا بچایا موجود تھا۔ ہجرت فرمائی تو گویا دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور مدینہ طیبہ پہنچ کر آپ بالکل بے سروسامان تھے۔ ابتدائی زمانہ انتہائی عسرت اور تنگ دستی کے ساتھ گزرا۔ پھر جب غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اموال غنیمت میں سے پانچواں حصہ نکالنے کا حکم دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق عطا فرمایا

کہ جس قدر مناسب سمجھیں اور ضرورت محسوس فرمائی، اپنی ذات پر اور اپنے قرابت داروں کی حاجات پر صرف کرنے کے لیے اس حصے میں سے لے لیا کریں، باقی اللہ تعالیٰ کے کام میں اور یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کی خبر گیری میں صرف فرمائیں۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ. (الانفال 8:41)

یہ پہلا ذریعۂ معاش تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا۔

اس کے بعد ہجرت کے چوتھے سال اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے یہودی قبیلے بنی النضیر پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح عطا فرمائی اور وہ اپنی جائدادیں چھوڑ کر شہر سے چلے گئے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

وَمَا اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰی مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَیْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ. (الحشر 59:7-6)

”اور جو کچھ دلوایا اللہ نے ان سے اپنے رسول کو، نہیں دوڑائے اس پر تم نے گھوڑے اور اونٹ، مگر اللہ مسلط کر دیتا ہے اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جو کچھ دلوائے اللہ (اس طریقے پر) اپنے رسول کو بستیوں کے لوگوں سے تو وہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور قرابت داروں اور یتامیٰ اور مسافروں کے لیے تاکہ یہ مال تمھارے دولت مندوں ہی کے درمیان نہ گردش کرتا رہے۔“

اس آیت کی رو سے اللہ تعالیٰ نے ان تمام اموال، جائدادوں اور علاقوں کو جو براہ راست جنگی کارروائی کے ذریعے سے فتح نہ ہوئے ہوں بلکہ اسلامی حکومت کے رعب اور دبدبے سے مسخر ہو جائیں، غنیمت سے الگ کر کے حکومت کی ملکیت قرار دے دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق عطا فرمایا کہ وہ اپنی اور اپنے قرابت داروں کی ضروریات کے لیے اس سرکاری مال میں جس قدر مناسب سمجھیں لے لیں۔

ان احکام کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں بنی النضیر کے چھوڑے ہوئے باغوں میں سے چند نخلستان، خیبر میں سے کچھ اراضی، اور فدک میں سے کچھ اراضی اپنے لیے مخصوص کرلی تھی۔ اس جائداد کی آمدنی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات پوری کرتے تھے، اپنے قرابت داروں کی مدد فرماتے تھے اور جو کچھ بچتا تھا، اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف فرما دیتے تھے۔

غور کیا جائے تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ ان دونوں ذرائع (غنیمت اور فے) سے جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا، اس کی نوعیت یہ نہیں تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی کاروبار سے کوئی جائداد پیدا کی ہو اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارثوں میں تقسیم ہو، بلکہ اس کی نوعیت یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے اپنا سارا وقت سرکاری کام پر صرف فرماتے تھے اور اپنا کوئی ذاتی ذریعۂ معاش نہیں رکھتے تھے، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق عطا فرمایا گیا کہ حکومت کی املاک میں سے اتنی جائداد اپنے تصرف میں رکھیں جس سے آپ کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا یہ کار عظیم اپنے لیے جائدادیں اور جاگیریں پیدا کرنے کے لیے تو نہیں کیا تھا۔ یہ تو ایک خدمت تھی جو خالص اللہ کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم انجام دے رہے تھے اور اس کا اجر اللہ کے ہی ذمے تھا۔ ریاست کے مال میں آپ کا حصہ بس اتنا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نفس کے اور اپنے اہل وعیال اور حاجت مند قرابت داروں کے حقوق ادا کر سکیں۔ یہ حصہ آپ کی حیات طیبہ تک ہی باقی رہ سکتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس کو ذاتی املاک کی طرح وارثوں میں تقسیم کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس بات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی زندگی میں صاف کر دیا تھا:

لا تقتسم ورثتی دینارًا ولا درهمًا، ماتركت بعد نفقة نسائی ومؤنة عاملی فهو صدقة.

(بخاری، مسلم، موطا، مسند احمد)

”میرے وارث کوئی دینار و درہم آپس میں تقسیم نہ کریں۔ میں نے جو کچھ چھوڑا ہے، میری بیویوں کا نفقہ اور میرے عامل کا حق الخدمت ادا کرنے کے بعد وہ سب صدقہ ہے۔“

لا نورث ماترکنا فھو صدقة انما یاکل اٰل محمد من ھٰذا المال لیس لھم ان یزیدوا علی الماکل.
(بخاری، مسند احمد، مسلم)

”ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا، جو کچھ ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والے تو اس مال میں سے بس کھا لیتے ہیں۔ کھانے بھر سے زیادہ لینے کا انھیں حق نہیں ہے۔“

ان اللہ عزو جل اذا اطعم نبیًا طعمةً ثم قبضه جعله للذی یقوم بعدہ.
(مسند احمد، مرویات ابو بکر صدیق)

”اللہ عزو جل کسی نبی کو بسر اوقات کے لیے جو کچھ دیتا ہے وہ اس کی وفات کے بعد اس شخص کے حوالے کر دیتا ہے جو اس کا جانشین ہو۔“

اس مال کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایات کچھ خفیہ نہ تھیں بلکہ تمام جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کو جانتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر ہی تنہا ان کے راوی نہیں ہیں۔ حضرت علی، حضرت عباس، حضرت عبد الرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عثمان اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم اور تمام ازواج مطہرات کی یہ شہادت نہایت مستند روایات سے ہم تک پہنچی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ترکے کی یہی نوعیت بیان فرمائی تھی۔ اس فرمان مبارک کے ہوتے ہوئے کون شخص یہ تصور کر سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چھوڑی ہوئی جائداد کے معاملہ میں کوئی دوسرا فیصلہ کرنے کے مجاز ہو سکتے تھے۔

اب دیکھیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مطالبۂ میراث کس طرح اٹھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفا نے اس پر اپنے اپنے زمانوں میں کیا کارروائی کی۔ شرعی قاعدے کے مطابق میراث کا مطالبہ کرنے کے حق دار تین فریق ہو سکتے تھے۔ ایک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، بیٹی کی حیثیت سے، دوسرے حضرت عباس رضی اللہ عنہ چچا کی حیثیت ہے، تیسرے جملہ ازواج مطہرات بیویوں کی حیثیت سے۔ ان میں سے پہلے دو فریقوں یعنی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلیفہ مقرر ہونے کے فوراً بعد خیبر، فدک اور مدینہ طیبہ کی اس جائداد کے متعلق جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تصرف

میں تھی، اپنا دعویٰ پیش کیا، اور بعض روایات کے مطابق حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے استدلال کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ جب تمھاری وفات کے بعد تمھارا ترکہ تمھارے اہل و عیال ہی میں تقسیم ہونا ہے تو آخر میرے باپ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد ان کے ترکے میں سے مجھے کیوں میراث نہ ملے؟ اس کے جواب میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ فرمایا، وہ یہ تھا:

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال لا نورث ما ترکنا صدقۃ وقال لست تارکا شیئًا کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یعمل بہ فانی اخشی ان ترکت شیئًا من امرہ ان ازیغ. (بخاری، کتاب فرض الخمس، مسند احمد، مرویات ابو بکر صدیق)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہماری وراثت جاری نہیں ہوتی، جو کچھ ہم نے چھوڑا ہے، وہ صدقہ ہے۔ پھر حضرت ابو بکر نے کہا کہ میں کوئی ایسا کام نہ رہنے دوں گا جو رسول اللہ کرتے تھے اور میں وہ نہ کروں، کیوں کہ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر میں سے کسی کو بھی چھوڑ دیا تو گم راہ ہو جاؤں گا۔“

ولکن اعول من کان رسول اللّٰہ یعولہ وانفق علی من کان رسول اللّٰہ ینفق. (ترمذی، کتاب السیر، باب ماجاء فی ترکتہ النبی، مسند احمد، مرویات ابو بکر صدیق)

”مگر میں ان سب لوگوں کی عیال داری کروں گا جن کی عیال داری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے، اور ان سب لوگوں پر خرچ کروں گا جن پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خرچ کیا کرتے تھے۔“

واللّٰہ لقرابۃ رسول اللّٰہ احب الی ان اصل من قرابتی. (بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث بنی النضیر)

”خدا کی قسم! میرے لیے اپنے رشتہ داروں سے صلۂ رحمی کرنے کی بہ نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرنا زیادہ محبوب ہے۔“

جناب سیدہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اس گفتگو کے متعلق جتنی مستند روایات ہم تک پہنچی ہیں، ان میں کسی میں بھی یہ بات کہیں اشارۃً یا کنایۃً بھی

مذکور نہیں ہے کہ جناب سیدہ یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی یہ بات سن کر جواب میں فرمایا ہو کہ آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک غلط بات منسوب کر رہے ہیں اور ظاہر بات ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس فرمان کی نسبت صحیح تھی تو پھر خلیفۂ رسول کے لیے واجب العمل قانون اس کے سوا اور کوئی نہ ہو سکتا تھا جو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت تھا۔ آخر اس فرمان کی زد جناب حضرت سیدہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ ہی کے مفاد پر تو نہ پڑتی تھی۔ خود خلیفہ کی اپنی صاحب زادی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مفاد بھی اس کی لپیٹ میں آجاتا تھا۔ کیوں کہ وہ بھی اس کی بنا پر اپنے شوہر کی میراث سے محروم ہوتی تھیں۔ خلیفہ برحق نے آخر انھی کو اس قانون سے کب مستثنیٰ کیا۔

اب رہ گیا تیسرا فریق، یعنی ازواج مطہرات کا گروہ، تو اس نے بھی ارادہ کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنا نمایندہ بنا کر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکے میں سے اپنے آٹھویں حصے کا مطالبہ کرے۔ مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کی مخالفت کی اور تمام ازواج مطہرات کو خطاب کر کے فرمایا:

الا تتقین اللّٰہ، الم تعلمن ان النبی کان یقول لانورث ماترکنا صدقة (یرید بذالك نفسه) انما یأکل ال محمد فی هذا المال.

”کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ڈرتیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ ہماری وراثت جاری نہیں ہوتی۔ جو کچھ ہم نے چھوڑا ہے وہ صدقہ ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل و عیال تو بس اس مال میں سے کھا سکتے ہیں۔“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ بات سن کر سب ازواج مطہرات اپنے دعویٰ سے دست بردار ہو گئیں۔

ایک بات اس سلسلے میں یہ کہی جاتی ہے کہ فدک کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دیا جائے گا۔ جناب سیدہ نے

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے خاص طور پر اسی کا مطالبہ کیا تھا اور شہادت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ام ایمن کو پیش کیا تھا۔ لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان کی شہادت قبول نہ کی اور فدک کی جائداد ان کے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا۔

مگر یہ قصہ حدیث کی مستند روایات میں سے کسی میں بھی مذکور نہیں ہے۔ البتہ بلاذری اور ابن سعید نے اسے نقل کیا ہے اور ان کے بیان میں بھی کافی اختلاف ہے۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے یہ بات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنی تھی بلکہ ام ایمن سے سنی تھی اور ان ہی کو شہادت میں پیش کر دیا۔ بہ خلاف اس کے بلاذری کی روایت یہ ہے کہ جناب سیدہ نے خود یہ دعویٰ کیا تھا کہ میرے والد نے مجھے فدک دیا ہے۔ پھر ایک روایت کی رو سے انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ام ایمن کو شہادت میں پیش کیا اور دوسری روایت کی رو سے ام ایمن اور رباح (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام) کو۔

یہ تو ہے اس قصے کی حیثیت بہ اعتبار روایت۔ اب قانونی حیثیت دیکھیے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل یا تو ہبہ ہو سکتا تھا یا وصیت۔ اگر کہا جائے کہ ہبہ ہے تو وہ اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی ہی میں فدک کا قبضہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا ہوتا۔ ورنہ محض زبان سے کسی چیز کو کسی کے لیے نامزد کر دینا، اور یہ نیت کرنا کہ وہ چیز مالک کے مرنے کے بعد معطیٰ لہ کو ملے گی، ہبہ نہیں بلکہ وصیت ہے۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ یہ وصیت تھی تو قرآن مجید میں میراث کا قانون نازل ہو جانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود یہ اعلان فرما چکے تھے کہ 'لاوصیۃ لوارث' اب ترکے کی تقسیم کے معاملہ میں کسی وارث کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی۔ پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہی اعلان کردہ قانون کے خلاف دوسرے وارثوں کو چھوڑ کر ایک خاص وارث کے حق میں کوئی وصیت فرمائی ہو گی۔

علاوہ بریں ہبہ یا وصیت کے سوال کو نظر انداز کر کے صرف اس شہادت ہی کو دیکھا جائے جو اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش کی گئی تو وہ صریحاً قرآنی قانون شہادت کے لحاظ سے ناکافی تھی۔ قرآن مجید کی رو سے یا تو دو مردوں کی شہادت معتبر ہے یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت۔ جناب سیدہ (اگر یہ قصہ درست مانا جائے) صرف ایک عورت، یا ایک مرد اور ایک عورت کی

گواہی لائی تھیں۔ اس صورت میں قانون کے خلاف فیصلہ کیسے کیا جا سکتا تھا؟ کیا شخصیتوں کو دیکھ کر شہادت کا شرعی نصاب بدل دیا جاتا؟

اس کے بعد یہ مسئلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں دوبارہ اٹھا۔ ان کی خلافت پر دو سال گزر چکے تھے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکے کا مسئلہ پیش کیا، اور انھوں نے خیبر و فدک کو مستثنیٰ کر کے مدینے والی جائداد دونوں صاحبوں کی تولیت میں اس شرط پر دے دی کہ وہ اس کی آمدنی انھی مصارف میں صرف کریں گے جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات طیبہ میں فرماتے تھے۔ لیکن اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے درمیان اس جائداد کے انتظام پر نزاع واقع ہو گئی اور وہ اس قضیے کو لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے۔ اس کا نہایت مفصل قصہ مالک بن اوس بن حدثان کے حوالہ سے تمام معتبر کتب حدیث میں روایت ہوا ہے۔

حضرت مالک کہتے ہیں کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا تھا کہ ان کے حاجب نے آ کر عرض کیا کہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، زبیر بن العوام اور سعد ابی وقاص رضی اللہ عنہ حاضری کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی اور وہ تشریف لے آئے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد وہ پھر آیا اور اطلاع دی کہ عباس رضی اللہ عنہ بن عبد المطلب اور علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب تشریف لائے ہیں اور وہ بھی اجازت کے طالب ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجازت دینے پر دونوں صاحب اندر تشریف لے آئے اور سلام کے بعد بیٹھتے ہی حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے امیر المومنین، میرے اور اس کے (اپنے بھتیجے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) مقدمے کا فیصلہ فرما دیجیے۔ اس کے ساتھ چچا نے بھتیجے کے حق میں کچھ سخت سست الفاظ بھی استعمال کیے۔ دوسرے حاضرین نے کہا واقعی امیر المومنین، ان کا قضیہ بہت طول کھینچ گیا ہے، آپ انھیں اس جھگڑے سے نجات دلائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ٹھہریے، میں آپ صاحبوں کو اس خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں جس کے حکم سے زمین و آسمان قائم ہیں، کیا آپ جانتے ہیں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ”ہماری وراثت جاری نہیں ہوتی، جو

کچھ ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے۔'' چاروں صاحبوں نے کہا، ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی فرمایا تھا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو اسی طرح اللہ کا واسطہ دے کر پوچھا، کیا آپ دونوں صاحب جانتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا اور ایسا فرمایا تھا؟ دونوں نے جواب دیا جی ہاں، واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، اچھا اب میں آپ لوگوں کو اس معاملے کی حقیقت بتاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فے کے معاملے میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ مخصوص اختیارات عطا فرمائے تھے جو کسی دوسرے کو عطا نہیں فرمائے۔ پھر سورۂ حشر کی آیت 'وَمَا اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ' آخر تک تلاوت کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اس آیت کی رو سے یہ اموال فے، خالصتاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھے۔ مگر خدا کی قسم! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ لوگوں کو چھوڑ کر ان سب کو اپنے لیے نہیں سمیٹ لیا اور نہ ان کے معاملے میں کوئی خود غرضی برتی، بلکہ انھیں آپ ہی لوگوں میں تقسیم کر دیا، یہاں تک کہ تین جائدادیں (مدینہ، فدک اور خیبر والی) بچ گئیں۔ ان جائدادوں میں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنا اور اپنے اہل و عیال کا سال بھر کا نفقہ لے لیتے تھے اور باقی ساری آمدنی انھی کاموں میں صرف فرماتے تھے جن میں اللہ تعالیٰ کا مال صرف کیا جاتا ہے۔ یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ان اموال کے معاملے میں زندگی بھر رہا ہے۔ میں آپ لوگوں کو خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ یہ بات آپ سب لوگوں کے علم میں ہے؟ چاروں صاحبوں نے جواب دیا: جی ہاں۔ پھر حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے مخاطب ہو کر کہا، میں آپ دونوں کو بھی خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں، آپ یہ بات جانتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا، جی ہاں ہم جانتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھا لیا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر کہ اب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ولی ہوں، ان اموال کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ان کے معاملے میں اسی طریقے سے عمل کیا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ اس میں ابو بکر رضی اللہ عنہ بالکل سچے تھے اور ٹھیک ٹھیک حق کے تابع تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بھی اٹھا لیا اور میں ان کا ولی ہوا۔ میں نے اپنی امارت کے پہلے دو سال تک اموال کو اپنے ہاتھ میں لے کر اسی طرح عمل کیا جس طرح رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کرتے تھے۔ اللہ جانتا ہے کہ میں بھی اس میں سچا اور تابع حق تھا۔ پھر (حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما سے مخاطب ہو کر فرمایا) آپ دونوں صاحب میرے پاس آئے اور آپ نے مجھ سے اس جائداد کے معاملے میں گفتگو کی۔ اس وقت آپ دونوں کے درمیان اتفاق تھا۔ اے عباس! آپ نے مجھ سے اپنے بھتیجے کی میراث طلب کی، اور اے علی! آپ نے مجھ سے اپنی بیوی کے واسطے سے ان کے والد کی میراث مانگی۔ میں نے آپ سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: 'لا نورث ما ترکنا صدقة' لہٰذا اگر آپ چاہتے تو میں اس شرط پر یہ جائداد آپ کے حوالے کر سکتا ہوں کہ آپ اس میں اسی طرح عمل کریں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ عمل کرتے رہے اور خلیفہ ہونے کے بعد سے عمل کر رہا ہوں۔ لیکن اگر یہ شرط آپ کو منظور نہ ہو تو مجھ سے اس معاملہ میں بات نہ کیجیے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چاروں صاحبوں کو خدا کا واسطہ دے کر پوچھا کیوں حضرات! میں نے اسی شرط پر یہ جائداد ان دونوں اصحاب کے حوالے کی تھی؟ انھوں نے کہا، ہاں۔ پھر حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو بھی اسی طرح خدا کا واسطہ دے کر پوچھا کہ اس جائداد کو حوالے کرتے وقت میری یہی شرط تھی؟ انھوں نے بھی اسے تسلیم کیا۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، اب آپ چاہتے ہیں کہ میں اس سے مختلف فیصلہ کر دوں۔ اس خدا کی قسم جس کے حکم سے زمین و آسمان قائم ہیں، میں کوئی دوسرا فیصلہ نہیں کروں گا، اگر آپ اس شرط پر عمل نہیں کر سکتے تو یہ جائداد میرے حوالے کر دیجیے، میں اس کا انتظام کر لوں گا۔ (بخاری: کتاب فرض الخمس)

یہ ہے اس معاملے کی پوری تاریخ جو حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں پیش آئی۔ اسے دیکھ کر ہر شخص خود رائے قائم کر سکتا ہے کہ اس معاملے میں جو کچھ کیا گیا تھا، وہ ظلم تھا یا عدل اور حق؟ اس کے ساتھ دو باتیں اور بھی ہیں جو صحیح رائے قائم کرنے کے لیے نگاہ میں رکھنی چاہئیں:

اول یہ کہ اصل بحث صرف یہ تھی کہ اس جائداد کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میراث میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یا نہیں، یہ بحث نہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل و عیال اور قرابت داروں کو بیت المال سے نفقہ پانے کا حق ہے یا نہیں؟ تاریخ گواہ ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود اپنی ذات اور اپنے خاندان والوں سے بدر جہا زیادہ ان حضرات کی خدمت کی۔ ان کے حق کو ہر دوسرے حق پر مقدم رکھا اور جو وظائف ان کے لیے جاری کیے، وہ خیبر اور فدک اور مدینہ طیبہ کی جائدادوں کے محاصل سے کہیں بڑھ کر تھے۔

دوسری بات جو اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے، بلکہ اس مسئلے میں فیصلہ کن ہے، وہ یہ ہے کہ خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو انھوں نے بھی اس جائداد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث قرار دے کر وارثوں میں تقسیم نہیں کی بلکہ اسے بدستور وقف فی سبیل اللہ ہی رہنے دیا۔

سوال یہ ہے کہ اگر یہ واقعی میراث ہی تھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے اپنے زمانۂ اقتدار میں وارثوں کو اس سے محروم رکھنا کیسے جائز ہو گیا؟ اسے ظلم ہی کہنے کو کسی کا جی چاہتا ہو تو پھر اسے اتنا انصاف تو کرنا ہی چاہیے کہ جس جس نے اس کا ارتکاب کیا ہے، ان سب کو ظالم کہے۔ ایک ہی فعل پر کسی کے حق میں ایک فیصلہ اور کسی دوسرے کے حق میں دوسرا فیصلہ کرنا حق پرست آدمی کا کام نہیں ہے۔

نعیم احمد بلوچ

حیاتِ امین

(سوانح مولانا امین احسن اصلاحی)

(13)

[صاحب ”تدبر قرآن“ کی وصیت کے مطابق
ان کے سوانح نگار نعیم احمد بلوچ کے قلم سے]

مولانا اصلاحی پٹھان کوٹ اکیلے گئے تھے۔ ان پر مولانا مودودی پہلے ہی یہ واضح کر چکے تھے کہ انھیں اپنے بچوں کو بھی یہاں لانا پڑے گا۔ اور وہ ان کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے بھی وعدہ کر چکے تھے کہ ان کے بارے میں آپ کو مُتردد ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ انتظام کیسے ہو گا، اس کا مولانا اصلاحی کو کوئی خاص اندازہ نہیں تھا۔ اب جب اس ”انتظام“ کے راز سے مولانا مودودی نے پردہ اٹھایا تو مولانا اصلاحی باقاعدہ پریشان ہو گئے۔ ان کے اپنے الفاظ میں:

”یہاں آ گیا تو ان لوگوں نے شادی کا ڈول ڈالنا شروع کر دیا... سمجھ گئے آپ؟ اور بتایا گیا کہ یہ کام بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ میں نے اس کا بہت شدت سے انکار کیا۔“

”اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے خاندان میں رواج نہیں ہے کہ کسی شخص کی بیوی مر جائے اور اس کے بچے ہوں تو وہ شادی کرے۔ یہ رواج بالکل نہیں تھا۔ ہمارے خاندان میں اس کو

لوگ بہت برا سمجھتے تھے۔ اور میرے معاملے میں یہ بھی تھا۔ یہ سمجھا جا رہا تھا کہ بچوں کی پھوپھیاں ہیں، وہ بچوں کو بہلا لیں گی۔ اس لیے بچوں کے لیے شادی کی کوئی ضرورت نہیں۔‘‘

مولانا اصلاحی کی دوسری شادی

مولانا یہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے خاندان میں اُس علاقے کے راجپوتوں کی روایات بہت مضبوط تھیں۔ مشترکہ خاندان اور اپنی برادری ہی میں شادی، اس معاشرت کی بہت پختہ اقدار سمجھی جاتی تھیں۔ اور ان پر ابھی اسلامی تعلیمات نے کوئی زیادہ اثر نہیں ڈالا تھا۔ لیکن مولانا مودودی اس حوالے سے بھی مولانا اصلاحی پر اثر انداز ہوئے۔

مولانا مودودی نے اپنے مخصوص منطقی انداز میں مولانا اصلاحی کے اس استدلال پر زور دار تنقید کی اور بالکل بجا طور پر کہا کہ یہ بالکل غلط ہے۔ پھوپھیاں چند دن تک آپ کی مدد کر سکتی ہیں، یعنی آخر ان کی شادیاں ہونی ہیں اور انھوں نے اپنے گھر جانا ہے۔ ان پر کیسے تکیہ کیا جا سکتا ہے۔ بچوں کا معاملہ اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ان کی تعلیم و تربیت کا تقاضا ہے کہ وہ یہاں آپ کے ساتھ رہیں۔ وہاں دیہات میں ویسے بھی ان کی تعلیم کے وسائل بہت کم ہیں۔

مولانا اصلاحی تسلیم کرتے ہیں کہ ’’تب میں نے محسوس کیا کہ میں نے بچوں کے معاملے کو سنجیدگی کے ساتھ نہیں لیا۔‘‘

لیکن جو سادہ اور فطری طریقہ مولانا مودودی تجویز کر رہے تھے، اس کے لیے مولانا اصلاحی ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ مولانا اپنا احساس بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وقتی طور پر میں نے یہ خیال کیا کہ پٹھان کوٹ لا کر انھوں نے مجھے شادی کے لیے پھانسنے کی کوشش کی ہے۔ مگر جب انھوں نے اس پر غور کیا تو وہ قائل ہو گئے کہ یہی مناسب ترین طریقہ ہے۔ یہ میرے لیے خیر خواہی کا مشورہ ہے، لیکن اس فیصلے کی بعض عملی مشکلات تھیں۔ ان کے بیٹے ماں کی وفات کے بعد اپنی پھوپھیوں سے مانوس ہو چکے تھے۔ انھیں ان سے الگ کرنا بہت نامناسب لگ رہا تھا۔ پھر دوسری شادی نہ کرنے کے لیے خاندان اور برادری کا دباؤ ایک اور رکاوٹ تھی، جسے انھیں عبور کرنا تھا۔

تب انھوں نے اپنے والد گرامی کو خط لکھا۔ انھوں نے مولانا مودودی کی ساری تجویز لکھ دی۔ یہ بھی لکھ دیا کہ مولانا اس شادی کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ دین کے لیے ہو رہی

ہے۔ اس لیے ہمیں امید کرنی چاہیے کہ اس میں خیر ہی برآمد ہو گا۔ جس خاتون سے شادی کی تجویز دی جارہی تھی، ان کے بارے میں بھی تفصیل بیان کر دی کہ وہ ایک متمول زمیں دار پنجابی گھرانا ہے۔ میرے لیے ایک مناسب گھر کا بھی بندوبست ہے۔ اپنے تحفظات بھی لکھ دیے کہ میری مالی حیثیت ان سے کم تر ہے۔ میرا مزاج بھی گرم ہے اور خاتون بھی ناز و نعم میں پلی ہیں، اس لیے نباہ نہ ہونے کا بھی خطرہ ہے اور اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ بچے اپنی سوتیلی والدہ سے مانوس نہ ہوئے تو پھر مسائل سلجھنے کے بجاے مزید الجھ سکتے ہیں۔ مولانا کا خیال تھا کہ ان کے والد یقیناً اس شادی کی اجازت نہیں دیں گے اور اس طرح ان کے پاس یہ عذر ہو گا کہ وہ والد کی حکم عدولی نہیں کر سکتے، لیکن ہوا یہ کہ ان کے والد صاحب نے انھیں لکھا کہ یہ تو کوئی ربانی اسکیم لگ رہی ہے، اس لیے یہ شادی ضرور کریں۔

ایک کامیاب شادی

اپنی اس شادی پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا کہتے ہیں:

”میں نے یہ شادی کرنے کی کسی درجے میں بھی خواہش نہیں کی تھی، کسی درجے میں بھی خواہش نہیں کی، کسی درجے میں بھی خواہش نہیں کی، لیکن جب ہو گئی تو اس کو پوری خوش اسلوبی کے ساتھ نبھانے کی کوشش کی اور اللہ تعالیٰ نے مجھے اس میں کامیاب کر دیا۔ یہ بھی ہے کہ اس میں مجھے بیوی کا تعاون بھی حاصل تھا اور میں نے اپنے مزاج میں بھی بڑی تبدیلی کی۔ رویے میں نرمی اور سعادت مندی پیدا کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس قسم کی بیوی سے تعلقات رکھنا چاہتا تھا جو اپنی ایک خاص شخصیت رکھتی ہوں۔ (اس کے برعکس اس زمانے میں) ہمارے ہاں کی جو بیویاں ہوتی تھیں، وہ تو سمجھ لیجیے کہ بس اپنی ہی دنیا میں مست رہتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ میاں بیوی دو مستقل الگ الگ ذہن رکھتے ہیں۔ ان میں کوئی ہم آہنگی نہیں۔ بیویوں نے صرف اور صرف ”سمع و طاعت“ ہی کرنی ہے۔ یہ ایک بالکل غیر فطری بات ہے۔ محض سمع و طاعت میں دوسرے کی شخصیت ختم ہو جاتی ہے، جب کہ ادھر معاملہ الگ تھا۔ ادھر وہ پنجاب کی تھیں اور وہ بھی ایک چودھری کی لڑکی۔ اب مزاج میں فرق تو تھا... لیکن یہ مجھے خوشی ہے کہ ان کے پورے خاندان نے میرے ساتھ محبت کی۔ (مولانا کے سسر) چودھری عبدالرحمٰن

صاحب میرے اوپر بہت اعتماد بھی کرتے تھے۔‘‘

اس فیصلے کے نتیجے میں مولانا کے بچے پٹھان کوٹ آ گئے، لیکن ایک بدمزگی اس وقت پیدا ہوئی جب ان کے بیٹے ابو سعد نے واپس اپنے ننھیالی گاؤں جانے کا فیصلہ کیا۔ مولانا کو یہ فیصلہ پسند نہیں تھا، لیکن انھوں نے اس میں رکاوٹ بھی پیدا نہیں کی۔ البتہ وہ اس وقت کبیدہ خاطر ہوئے جب ابو سعد نے اپنے چھوٹے بھائی ابو صالح کو بھی ساتھ جانے کے لیے تیار کر لیا۔ لیکن ان کی بیٹی اپنی سوتیلی والدہ محترمہ انوار الرحمت سے مانوس ہو چکی تھیں، اس لیے وہ وہیں ٹھہر گئیں۔

مولانا اصلاحی کے اپنے سسرالی رشتے داروں سے بہت محبت کے تعلقات رہے۔ اپنے اس تعلق کو خوشی سے بیان بھی کرتے کہ ان کی خواہر نسبتی محترمہ نثار فاطمہ ان سے بہت مانوس ہو گئیں اور وہ اپنی شادی تک ان کے ہم راہ ہی رہیں۔

جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کا دفاع

اس سے پہلے یہ بیان ہو چکا ہے کہ مولانا اصلاحی مولانا منظور نعمانی ہی کے اصرار پر جماعت اسلامی میں شامل ہوئے تھے، لیکن جلد ہی انھیں ایک حیرت انگیز معاملے کا سامنا کرنا پڑا۔ ہوا یہ کہ مولانا منظور نعمانی اور مولانا ابو الحسن ندوی جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو گئے۔ مولانا منظور نعمانی نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ مولانا مودودی تقویٰ اور اسلامی شعار کے اس طرح سے پابند نہیں ہیں، جیسا کہ ان کے نزدیک ایک اسلامی تحریک کے سربراہ کو ہونا چاہیے۔ اب یہ مولانا اصلاحی کے لیے بڑا حیران کن امر تھا۔ جیسا کہ یہ بیان ہو چکا ہے کہ وہ خود بھی اپنے مزاج کے خلاف اور مولانا مودودی کی علمی استعداد پر غیر مطمئن ہونے کے باوجود جماعت میں شامل ہوئے تھے، لیکن اب مولانا نعمانی ان کو جماعت میں شامل کرانے کے بعد پیچھے ہٹ رہے تھے۔ خود مولانا منظور نعمانی کے الفاظ میں:

> ’’یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ میرے سامنے اس وقت یہ مسئلہ نہیں تھا کہ مولانا مودودی امارت کے اہل نہیں ہیں، لہٰذا انھیں امارت سے الگ ہو جانا چاہیے یا یہ کہ مولانا مودودی کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے جماعت کی شرکت اور رکنیت اب جائز نہیں رہی ہے، بلکہ میرے سامنے اصل مسئلہ اس وقت صرف اپنی ذات سے متعلق یہ تھا کہ میں مولانا کے

بارے میں بارہا ایک شہادت دے چکا ہوں (بلکہ مولانا نعمانی ہی نے جماعت کے تاسیسی اجلاس میں امارت کے منصب کے لیے مولانا مودودی کا نام پیش کیا تھا۔) اور اب مجھے معلوم ہوا کہ میری وہ شہادت صحیح اور واقعہ کے مطابق نہیں تھی۔ ایسی حالت میں اگر میں بدستور جماعت کا رکن رہتا ہوں تو گویا اپنے عمل سے مسلسل وہ شہادت دیتا ہوں جو میرے علم میں سچی شہادت نہیں ہے۔ بس یہ تھی میری اصل مشکل جس کا کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آیا اور میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔ اس کے علاوہ بعض اور چیزیں بھی اس احساس میں شامل ہو گئی تھیں، لیکن وہ اس درجہ کی نہیں تھیں۔ سب سے اہم اور بنیادی چیز یہی تھی۔"

(مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگذشت، مولانا منظور نعمانی 65)

جماعت اسلامی، مولانا مودودی، علماے دیوبند اور مولانا اصلاحی، ان سب کے لیے تاریخ کا یہ باب ہمارے نزدیک بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے ان بزرگوں کے درمیان اختلاف کا اصل سَرِ رِشتہ معلوم ہوتا ہے اور دبستان شبلی کے علما کا روایتی علما سے اختلاف کی اصل جڑ معلوم ہوتی ہے، اس لیے مناسب ہے کہ اس کا ایک مبسوط طریقے سے اجمالی جائزہ لیا جائے۔

مولانا منظور نعمانی کی توقعات

معلوم رہے کہ مولانا منظور نعمانی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کا تعلق دیوبند مکتبۂ فکر سے تھا۔ وہ بنیادی طور پر ائمۂ اربعہ کی تقلید کو ایمان کی سلامتی کے لیے ضروری سمجھتے تھے اور ان ائمہ کی آرا سے باہر کسی بھی راے کو اختیار کرنا درست نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح وہ تصوف کی پوری روایت کے اندر کھڑے ہو کر اُسی دینی تعبیر کو درست سمجھتے تھے جو تصوف کے اہل علم نے اختیار کی تھی۔ اسی طرح دین کے سیاسی غلبے کے لیے سید احمد شہید کی تحریک کو اختیار کرنا چاہتے تھے، جب کہ دبستان شبلی کے علما، یعنی مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی اللہ اور اس کے رسول کے سوا کسی کی تقلید کو درست نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح وہ تصوف کی دینی تعبیر کو بھی درست نہیں گردانتے تھے اور تجدید واحیاءِ دین کی جدوجہد میں بھی اپنا ایک خاص نقطۂ نظر رکھتے تھے۔

جب مولانا مودودی نے اپنے جریدے "ترجمان القرآن" کے ذریعے سے مسلمانوں کے سیاسی و ملی زوال پر بڑے دردمندانہ علمی اور دانش وارانہ مضامین لکھے تو ہر باشعور مسلمان نے

اسے اپنے دل کی آواز سمجھا اور وہ ان کی طرف کھچے چلے آئے۔ مولانا منظور نعمانی، مولانا علی میاں، مولانا اصلاحی جیسے بیسیوں اہل علم ان کی ایسی ہی تحریروں سے بے پناہ متاثر تھے۔ یہ برصغیر میں جنگ عظیم دوم کا دور تھا۔ اس دور کا درست اور مستقبل بیں ادراک رکھنے والے کئی اہل علم اور دانش ور جان چکے تھے کہ برصغیر پر برطانیہ عظمیٰ کا تسلط اب قائم نہیں رہ سکے گا اور ہندستان کا کوئی دوسرا سیاسی بندوبست ناگزیر ہے۔ چنانچہ کانگریس نے ہندستان چھوڑ دو کی تحریک برپا کر رکھی تھی۔ اس وقت برصغیر کے مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو چکے تھے: ایک گروہ کانگرس کی رائے کا قائل تھا اور دوسرا مسلم لیگ کا۔ ان حالات میں مولانا مودودی نے بہ تدریج ایک تیسرے گروہ کی طرح ڈالی۔ 1940ء کے بعد وہ اصولی طور پر مسلم لیگ کے تقسیم ہند کے نقطۂ نظر کو درست سمجھتے تھے، لیکن مسلم لیگ کی قیادت کے بارے میں انھیں یقین ہو چکا تھا کہ وہ نا اہل اور غیر مناسب ہے۔ اسے وہ منزل حاصل نہیں ہو سکے گی جس کا خواب وہ مسلمانوں کو دکھا رہی ہے۔ چنانچہ مولانا مودودی نے جماعت اسلامی قائم کر کے متبادل قیادت کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ اور ساتھ ہی اسلامی معاشرے کی تربیت اور سیاسی بالادستی کے لیے اپنے لائحۂ عمل کے کچھ اجمالی نکات بھی بیان کر دیے۔ یہاں تک درد دل رکھنے والے مٹھی بھر عام و خاص ان سے متفق تھے، مگر جب جماعت اسلامی بن گئی اور باہمی ربط و ضبط استوار ہوا، مکالمے اور باہمی تبادلۂ خیال ہوا تو بہت سارے اختلافات سامنے آ گئے۔ جذباتی فضا ختم ہو گئی اور سوچنے سمجھنے والے لوگوں، خاص طور پر اہل علم و دانش کے سامنے بہت سے سوال کھڑے ہو گئے... ابتدا ہی میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے اہل علم کا پس منظر یہی تھا۔ اسی پس منظر میں ہم مولانا منظور نعمانی کے خیالات نقل کرتے ہیں، جس سے ہمیں صورت حال کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی:

> ”مولانا مودودی سے پہلی ملاقات: ابھی تک سارا تعلق غائبانہ تھا۔ (اس سے اوپر مولانا نعمانی تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ وہ مولانا مودودی کی ”ترجمان القرآن“ میں شائع ہونے والی تحریروں سے کس درجے میں متاثر تھے۔) ملاقات کی کبھی نوبت نہیں آئی تھی۔ میں نے ان سے ملاقات اور مستقبل کے منصوبے اور کام کے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے دہلی کا سفر کیا۔ میں یہ بات سن چکا تھا کہ مولانا مودودی صاحب کے ایمان افروز مضامین سے ان کے طرز زندگی کے بارے میں جو اندازہ کوئی لگا سکتا ہے، ان کی زندگی اس سے بہت مختلف ہے۔ چنانچہ

ایک محترم بزرگ نے لکھا تھا کہ اب مودودی صاحب کے چہرے پر ایمان کی کھیتی اُگنا شروع ہو گئی ہے۔ مجھے اس اطلاع سے بڑی خوشی ہوئی تھی۔ بہر حال میں مولانا سے ملنے کے لیے دہلی پہنچا۔... شمسی کالج پہنچ کر ملاقات کی۔ واقعہ یہ ہے کہ پہلی دفعہ مولانا کو دیکھ کر طبیعت کو ایک دھچکا سا لگا کیونکہ اب بھی مولانا کی ہیئت اس سے بہت مختلف تھی جو ہونی چاہیے تھی۔ اور جس کی توقع پیدا ہو گئی تھی، وہ اس وقت 'مَحلُوقُ اللِحیَہ' (ڈاڑھی کے بغیر) تو نہیں تھے، لیکن اس لحاظ سے ان میں بس برائے نام ہی تبدیلی آئی تھی۔ مگر چونکہ مولانا کے مضامین سے میں بہت متاثر تھا... جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ واقعہ 1937ء کا ہے، جب "ترجمان القرآن" میں چار پانچ برس سے مولانا کے وہ ایمان افروز مضامین شائع ہو رہے تھے جنھوں نے ہم جیسے کو ان کا گرویدہ و عاشق بنا دیا تھا اور میرا تصور ان کے بارے میں وہی تھا جو دین کے کسی داعی کے بارے میں ہونا چاہیے اور ان کے ساتھ ایک خاص قلبی تعلق پیدا ہو گیا تھا، اس لیے دل کو سمجھایا کہ عملی زندگی کی اصلاح کا بھی آغاز ہوا ہے۔ ان شاءاللہ آیندہ یہ حالت نہیں رہے گی اور ان کی زندگی اور تحریر میں جو مطابقت ہونی چاہیے، وہ ان شاءاللہ ہو جائے گی۔ آیندہ کام کے بارے میں اس ملاقات میں کسی قدر تفصیلی گفتگو ہوئی۔ اس کے کئی مہینے بعد وہ وقت آیا، جب مولانا حیدرآباد سے منتقل ہو کر پٹھان کوٹ کے قریب دارالاسلام نامی اس نو تعمیر بستی میں آ گئے جس کو وہاں ایک مخلص صاحب خیر چودھری نیاز علی صاحب نے اسی نیت سے بنایا اور وقف کیا تھا کہ اللہ کے کچھ بندے یہاں قیام کر کے دین کی کوئی ٹھوس خدمت سرانجام دیں گے۔"

(مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگذشت، مولانا منظور نعمانی 65)

یاد رہے کہ فقہ حنفی کی مطابق ایک مشت سے کم ڈاڑھی کا ہونا فسق کی علامت ہے اور فاسق کی نماز میں امامت مکروہ ہے۔ اور یہاں مولانا مودودی پوری ایک اسلامی جماعت کی تاسیس کرنے اور اس کی امامت کرنے جا رہے تھے۔

اس کے بعد مولانا نعمانی اپنی ان کوششوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں انھوں نے مولانا مودودی سے بعض کاموں کا بہ طور خاص وعدہ لیا کہ وہ ان کا اہتمام کریں گے۔ ایک تو انھوں نے ان سے کم از کم مشت بھر ڈاڑھی رکھنے کا وعدہ لیا اور پھر ان سے "انگریزی فیشن" کے بال کٹوانے کی فرمایش کی۔ مولانا کو علمی طور پر انھوں نے قائل بھی کرنے کی کوشش کی، لیکن مولانا مودودی اگرچہ اس

مسئلے کو ''قابل غور'' ہی قرار دے سکے، لیکن انھوں نے اس پر عمل کرنے کا وعدہ ضرور کر لیا اور اس کے لیے ''مہلت'' بھی مانگی۔ یاد رہے کہ اس طرح کے تمام معاملات حلیے ہی تک محدود تھے اور ابھی دینی اصولوں کی تعبیر اور اسلام کے فکر و فلسفے کی شرح و وضاحت تک نوبت نہیں آئی تھی۔ مولانا نعمانی نے اس میں مولانا اصلاحی کا بھی ذکر کیا ہے کہ انھوں نے ان کو بھی اس جانب توجہ دلائی کہ وہ مولانا مودودی کو ان چیزوں کا خیال رکھنے کے لیے اپنا اثر و رسوخ بھی استعمال کریں۔ مولانا اصلاحی کی بعض باتوں سے اس کی جزوی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ اس حوالے سے مولانا نعمانی لکھتے ہیں:

''مولانا اصلاحی اس وقت تک جماعت کے رکن بن چکے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا: بھائی صاف بات یہ ہے کہ میں مودودی صاحب کو نہیں جانتا، تمھیں جانتا ہوں۔ اگر مودودی صاحب کل کو کسی غلط راستے پر چل پڑے تو میں خدا کے سامنے تمھیں پکڑ کے پیش کروں گا کہ ان سے پوچھیے، میرے ذمہ دار بھی یہی ہیں۔ لیکن یہ گفتگو کچھ اس طرح سے تھی کہ میں نے اس کو ایک طرح کا مزاح ہی سمجھا۔ البتہ میں نے اس موقع پر انہیں یہ بتا دینا ضروری سمجھا کہ مودودی صاحب کے بارے میں میرا خیال اور اندازہ کیا ہے مجھے یاد آتا ہے کہ اس وقت میں نے ان سے کہا تھا کہ اصل بات یہ ہے کہ اس دعوت اور اس کام کے لیے جیسا قائد چاہیے مودودی صاحب ویسے تو نہیں ہیں لیکن اگر ان کے ساتھ دو چار آدمی ایسے مل جائیں جو ان کسروں کو پورا کر لیا کریں گے جو ان میں ہیں تو انشاء اللہ کچھ کام چل جائے گا۔'' (53-52)

لیکن آگے چل کر وہ واقعہ پیش آیا جس نے مولانا نعمانی کے بہ قول انھیں ''جھنجھوڑ'' کر رکھ دیا۔ یہ واقعہ انھی کی زبانی سنتے ہیں:

''وہ واقعہ جس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا: جس دن راقم دارالاسلام پہنچا تھا، اس کے اگلے ہی دن کسی نماز کے بعد مسجد ہی میں مولانا مودودی صاحب نے موجودہ رفقا کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کسی اسلامی بستی کے لیے ایک محتسب بھی ضروری ہے اور میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ یہ ذمہ داری آپ لیں۔ میں نے کہا کہ ابھی تو چند ہی آدمی ہیں۔ ایسے میں کسی محتسب کی کیا ضرورت ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ اس کی بنیاد ابھی سے پڑنی چاہیے۔ بہر حال مجھے محتسب بنا دیا گیا۔ اور یہ بات بھی اسی مجلس میں ذکر میں آگئی کہ میری یہ ذمہ داری ہے کہ اس پر نگاہ رکھوں

کہ ہمارے اس دائرہ میں کوئی بات شریعت کے خلاف نہ ہو۔ میرے قیام پر دو چار ہی دن گزرے ہوں گے کہ غالباً کسی رفیقِ جماعت کے ذریعے سے میرے علم میں یہ بات آئی کہ مولانا کا باورچی جو جوان العمر تھا، زنان خانے میں کھانا پکاتا ہے اور اس سے پردہ نہیں ہے اور یہ کہ دارالاسلام کے مقیم رفقا پر اس کا اثر برا پڑ رہا ہے۔ پہلے تو میرے دل و دماغ اس پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ میں سوچتا تھا کہ ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟ مولانا کی کتاب ”پردہ“ اس سے بہت پہلے شائع ہو چکی تھی، لیکن بالآخر معلوم ہو گیا کہ واقعہ یہی ہے۔ اس واقعے نے مجھے ہلا کر کے اور جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی ہو گی کہ اب تک جس ماحول میں میری زندگی گزری تھی، اُس میں اِس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کسی بھی درجے کے تقوے اور دین دار زندگی کے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ جماعت کے دستور میں صف اول کے ارکان کے بارے میں لکھا ہوا تھا کہ ان لوگوں کے لیے احکامِ شریعہ کی پابندی کے معاملے میں کوئی رعایت نہ ہو گی۔ ان کو مسلمانوں کی زندگی کا پورا نمونہ پیش کرنا ہو گا اور ان کے لیے رخصت کے بجاے عَزِیمَت کا طریقہ ہی قانون ہو گا۔ دستور میں امیر کے لیے جو صفات ضروری قرار دی گئی تھیں، ان میں علمِ دین میں بصیرت اور اصابت راے سے پہلے تقویٰ کا ذکر تھا۔“

[باقی]

غطریف شہباز ندوی

امام شافعی اور ان کا تجدیدی کارنامہ

[150ھ-204ھ]

(1)

زندگی ہر آن متحرک اور تغیر پذیر ہے۔ وہ رواں دواں اور سدا بہار جوان ہے۔ بہ قول اقبال

جاوداں، پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی

اللہ تعالیٰ نے دنیا کے لیے جس دین کو پسند کیا اور بندوں کو جس کا مکلف بنایا ہے، وہ ابدی حقائق پر مشتمل ہے۔ اس کے عقائد و مسلمات کو خلود عطا کیا گیا ہے، مگر ساتھ ہی وہ بھی زندگی سے بھرا اور حرکت و نشاط سے معمور ہے۔ ”یہ دین چونکہ آخری اور عالمگیر دین ہے اور یہ امت آخری اور عالمگیر امت ہے۔ اس لیے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ دنیا کے مختلف انسانوں اور مختلف زمانوں سے اس امت کا واسطہ رہے گا... اس امت کو جو زمانہ دیا گیا ہے وہ سب سے زیادہ پر از تغیرات اور پر از انقلابات ہے“۔[1] مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے بہ قول زمان و مکان کی تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے دو انتظامات فرمائے ہیں: ایک یہ کہ اس کی تعلیم جامع و کامل اور زندہ ہے اور دوسرے اس دین کو ہر دور میں ایسے زندہ رجالِ کار عطا ہوتے رہے ہیں جو اس کی تجدید کرتے ہیں۔ امام شافعی بھی ایسے ہی رجال اللہ اور مجددین اسلام میں سے

---

[1]۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت، حصہ اول، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، 1992، ص 18۔

ہیں جو اپنے تعلق باللہ، زبان دانی، اخلاص وللّٰہیت، قانونی فہم، علمی انہماک، قوت حفظ، فہم قرآن و حدیث اور خدمت دین میں ممتاز ہیں۔

اسلام کی تاریخ میں ائمۂ اربعہ کا ظہور ایک معجزہ تھا، جن میں امام ثالث حضرت امام شافعی کا امتیاز یہ ہے کہ وہ افقہ الامہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ اور امام دار الہجرت امام مالک کے بعد آئے اور دونوں کے مدرسہ ہائے فکر اور مناہج فقہ کی خوبیوں کے جامع ہوئے۔ انھوں نے دونوں ہی مکاتب فکر سے خوشہ چینی کی۔ ان کے علاوہ انھوں نے تقریباً 19 شیوخ سے علم اخذ کیا، جن میں فقیہ الشام امام اوزاعی کے شاگرد عمر بن ابی سلمہ اور فقیہ مصر لیث بن سعد کے شاگرد یحییٰ بن حسان سے ان کی فقہ اخذ کی۔ وہ امام لیث کی فقاہت سے بہت متاثر ہوئے، یہاں تک کہ انھوں نے کہا کہ 'اللیث افقه من مالك الاان اصحابه لم یقوموابه'، (لیث مالک سے بڑے فقیہ ہیں، مگر ان کے شاگردوں نے ان کو اٹھایا نہیں۔)[2] شافعی کے شیوخ میں یمنی، کوفی، بصری، مکی اور بغدادی استادوں کے نام بھی آتے ہیں۔ امام مالک کے سامنے تو ان کو بہ نفس نفیس زانوے تلمذ تہ کرنے کا شرف ملا۔ فقہِ حجاز یا مدرسۃ الحدیث سے استفادہ کے بعد وہ عراق گئے، جہاں مدرسۂ کوفہ یا مدرسۃ اہل الرائے[3] کے قریب آئے اور انھوں نے فقہ حنفی کے محرر امام محمد بن الحسن سے کسب فیض کیا۔ یوں وہ حدیث و فقہ، دونوں کے جامع بنے اور اپنی شاداب عقل، زرخیز دماغ، بحث و استدلال

---

[2]۔ الامام محمد ابوزہرہ، الشافعی حیاتہ و عصرہ فقہہ و آرا، طبع ثانی دار الفکر العربی 1978، ص 47۔

[3]۔ اہل الرائے اور اہل الحدیث محض تغلیباً ہے۔ رائے سے مراد ہے کہ قرآن و حدیث میں اگر کسی مسئلہ میں صریح حکم نہیں مل رہا ہے تو اجتہاد کیا جائے، جیسا کہ فقہائے عراق کرتے تھے، مگر ایسی صورت حال میں فقہائے حجاز اجتہاد کا رجحان کم رکھتے تھے۔ تاہم ایسا نہیں ہے کہ مدرسۃ اہل الرائے یعنی مدرسۂ کوفہ حدیث کو چھوڑ کر رائے پر عمل کرتا تھا اور نہ ہی یہ مطلب ہے کہ مدرسۃ اہل الحدیث میں رائے اور تفقہ سے کام ہی نہیں لیا جاتا تھا۔ فرق صرف کم و بیش کا ہے اور ان دونوں ہی رجحانوں کی دلیل اسوۂ نبوی میں ملتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اہل الرائے اور اہل الحدیث کا استعمال تغلیباً ہوتا ہے اور دو مختلف مناہج فکر کو بتانے کے لیے ہوتا ہے۔ اور یہاں اہل الحدیث سے مراد ہمارے زمانہ کا فرقہ اہل حدیث تو ہرگز مراد نہیں ہے، جس پر ظاہریت کی چھاپ اور آج کل ائمۂ فقہ اور خاص کر فقہ حنفی سے عداوت کا غلبہ ہے۔

اور کلام و منطق کی زبردست اور خداداد صلاحیتوں کے باعث دونوں ہی سابق فقہوں سے اپنی الگ راہ نکالی اور تیسرے مذہبِ فقہ (مسلک) کے بانی و موسس ہوئے۔

سوانح زندگی

نام محمد والد کا نام ادریس بن عباس بن عثمان بن شافع تھا، نسبی تعلق قریش کے بنو عبد المطلب سے تھا، عبد مناف میں آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کا نسب مل جاتا ہے۔ فلسطین کے شہر غزہ میں سنہ 150 ہجری میں پیدا ہوئے۔ خدا کی شان ہے کہ اسی دن حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کی وفات ہوئی تھی۔ شافعی کے والد کا سایہ بچپن میں ہی سر سے اٹھ گیا، ان کی تمام تر پرورش والدہ نے کی۔ جب دو سال کے ہوئے تو والدہ محترمہ ان کو لے کر ان کے گھر والوں کے پاس مکہ آگئیں۔ عسرت، یتیمی و تنگ دستی کے باوجود خاندانی وقار کی حفاظت اور اعلیٰ اخلاق پر تعلیم و تربیت ہوئی۔ امام شافعی کو غیر معمولی ذہانت، جفاکشی، دور اندیشی کے ساتھ ہی غضب کا حافظہ عطا ہوا تھا۔ جلد ہی شعر و ادب میں بھی طاق ہو گئے کہ مدتوں تک مکہ سے دور صحرا میں بنو ہذیل کے درمیان رہ کر عربی لغت، محاورے اور فصاحت و بلاغت سیکھی تھی، ساتھ ہی تیر اندازی میں بھی حذاقت تامہ حاصل کر لی۔ بنو ہذیل کے ہاں سے واپس آکر مکہ کے علما کے پاس قرآن حفظ کیا اور حدیث و فتویٰ کی تعلیم حاصل کی۔ ان کے استاد مسلم بن خالد زنجی نے ان کی قابلیت کی شہادت دیتے ہوئے فرمایا:

"اے ابو عبد اللہ، اب تم فتویٰ دو، کیونکہ فتویٰ دینے کے اہل ہو چکے ہو۔"[4]

مگر شافعی کو ابھی علمی تشنگی کا احساس تھا، چنانچہ انھوں نے امام مالک کے درس حدیث اور ان کی کتاب "موطا" کا شہرہ سنا تو مدینہ کی راہ لی۔ والیِ مکہ نے ان کے لیے ایک سفارشی خط امام مالک کی خدمت میں لکھ دیا تھا، مگر امام مالک کی خدمت میں حاضری دینے سے پہلے ہی مکہ کے کسی عالم سے "موطا" لے کر پوری پڑھ لی، بلکہ حفظ کر لی تھی۔ اس کے بعد مدینہ حضرت امام مالک کی خدمت

---

[4]۔ الامام محمد ابو زہرہ، الشافعی حیاتہ و عصرہ فقہہ و آرا، طبع ثانی دار الفکر العربی 1978 اور اجتباء ندوی، تاریخ فکر اسلامی، المرکز العلمی، نئی دہلی، 1998۔

میں حاضر ہوئے۔ جس کا حال یوں لکھا ہے:

”میں صبح سویرے امام مالک کی خدمت میں پہنچ گیا اور موطا زبانی پڑھنی شروع کر دی حالاں کہ کتاب میرے ہاتھ میں تھی، امام صاحب سننے لگے، جب مجھے خیال آیا کہ امام مالک تھک گئے ہوں گے تو میں نے قراءت روکنی چاہی، مگر حضرت امام کو میری قراءتِ موطا اتنی پسند آئی تھی کہ انھوں نے فرمایا: اے نوجوان اور پڑھ، چنانچہ یوں میں نے چند دنوں میں پوری موطا ان کو سنائی اور ختم کر لی۔“[5]

اس کے بعد شافعی فقہ و حدیث میں امام مالک سے مستفید ہونے لگے، یہاں تک کہ اصحابِ مالک میں شمار ہونے لگے اور ان کی وفات (179ھ) تک ان کے سرچشمۂ علم سے سیراب ہوتے رہے۔

پھر یمن کے گورنر شافعی کو اپنے ساتھ لے گئے اور علاقۂ نجران کا قاضی مقرر کر دیا۔ جہاں آپ پوری جرأت، عدل وانصاف اور خوفِ خدا کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے لگے، تاہم اس گورنر کے بعض عمال ومقربین کی زیادتیوں پر کھلی اور شدید تنقید نے اس کو آپ سے ناراض کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ احسان کے بدلے آپ اس کی رعایت کریں اور کاسہ لیسی سے کام لیں۔ بے چارے نے آپ کو دنیا کے عام لوگوں پر قیاس کیا ہوگا۔ بہر حال، اس نے آپ سے یوں انتقام لیا کہ خلیفہ کی خدمت میں آپ کی شکایت لکھ بھیجی کہ یہاں کئی علوی لوگ ہیں اور ایک قریشی نوجوان ان کا حمایتی ہے۔ یہ لوگ خلافت پر خروج کا ارادہ رکھتے ہیں اور میرے قابو میں نہیں آرہے۔ عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے ان سب لوگوں کو اپنے دربار میں بغداد بلا بھیجا۔ امام شافعی علویوں سے محبت رکھتے تھے، مگر ان پر بغاوت کا الزام بالکل غلط تھا۔ ان علویوں کو خلیفہ نے سزا دی، مگر اپنی باری آنے پر امام صاحب نے اپنی طلاقت لسانی اور زور بیان کے بل پر اپنے کیس کی وکالت کی اور خلیفہ کے قاضی امام محمد بن الحسن تلمیذ رشید ابو حنیفہ کی سفارش پر چھوڑ دیے گئے۔ یہیں سے وہ امام محمد کے رابطہ میں آئے اور انھوں نے امام محمد کے علم و تفقہ سے فیض اٹھایا، ان سے مذاکرے کیے اور عراقی مکتب فکر اور اس کے منہج سے براہ راست واقفیت حاصل کی۔ یہاں سے فارغ ہو کر شافعی مکہ گئے، جہاں انھوں نے حرم مکی میں نو سال تک درس دیا۔ امام احمد بن حنبل نے مکہ ہی میں

[5]۔ حوالۂ سابق، اور اجتباء ندوی، تاریخ فکر اسلامی، المرکز العلمی، نئی دہلی، 1998ء۔

ان کے آگے زانوے تلمذ تہ کیا ہے اور جب 195ھ میں شافعی دوبارہ بغداد آئے تو امام احمد نے ان کا بڑا اعزاز کیا۔ بغداد کے اس سفر میں انھوں نے فقہ مالکی اور فقہ حنفی سے الگ اپنی فقہی آرا کا اظہار شروع کیا اور بغداد کے علما و فقہا سے ان کے مذاکرے ہوئے۔ بغداد میں انھوں نے جو فتوے دیے، انھی کو فقہ شافعی میں 'قول قدیم' کہا جاتا ہے۔ مصر بھی اس وقت اہل علم کا مرکز تھا، جہاں امام مالک کے بہت سے تلامذہ استاد کی فقہ کو عام کر رہے تھے، مصر ہی میں امام لیث بن سعد تھے، جن سے شافعی کی مراسلت ہوئی تھی۔ 199ھ میں شافعی مصر گئے، جہاں انھوں نے اپنا فقہی مذہب باقاعدہ قائم کیا، وہاں ان کو بہت سے تلامذہ میسر آئے۔ مصر میں انھوں نے اپنے بہت سے خیالات کی تنقیح کی اور بہت سی سابق آرا سے رجوع کیا اور نئی رائے پر فتوے دیے، جن کو 'قولِ جدید' کہا جاتا ہے۔ 204ھ میں مصر کے اندر ہی شافعی کی وفات بھی ہوئی۔ جس کے مختلف اسباب بتائے جاتے ہیں۔[6] ان کے تلامذہ بویطی، سلیمان بن الربیع وغیرہ نے مصر میں ان کے مسائل و فتاویٰ کو مدون کیا اور یہیں سے شافعی مسلک کی عالم اسلام کے مختلف خطوں میں اشاعت ہوئی۔

[باقی]

---

[6]۔ مشہور قول کے مطابق بواسیر کے مرض سے بہ عمر 54 سال امام شافعی کی وفات ہوئی اور ''معجم یاقوت'' کی روایت کے مطابق کسی فتیان نامی متعصب مالکی شخص سے ان کا مناظرہ ہوا، جس میں شافعی نے اس کو لاجواب کر دیا۔ اس نے امام صاحب سے بدسلوکی کی، جس کی شکایت کسی نے جا کر والی مصر سے کر دی، جس پر اس نے فتیان کو سزا دلائی۔ جذبۂ انتقام میں اس کے ساتھی امام صاحب کے حلقہ میں پہنچ گئے اور جب آپ کے سب تلامذہ اور اصحاب چلے گئے تو آپ پر حملہ کر دیا۔ ان کے زدوکوب کرنے سے آپ زخمی ہو گئے، جن کی تاب نہ لا کر چند دن بعد انتقال فرما گئے۔ (الامام محمد ابوزہرہ، الشافعی 32)

خیال و خامہ

جاوید احمد غامدی

جرم ضعیفی

[المیۂ کوسووا پر لکھی گئی]

اِس شاخ پہ کژدم ہیں تو اُس شاخ پہ اژدر
بیٹھے ہیں کہ محرومِ نشیمن ہوں پرندے
باقی ہے کوئی داد نہ فریاد کی صورت
بستی میں نکل آئے ہیں جنگل سے درندے

اترے ہیں جہنم سے کہ ماؤں نے جنے ہیں
یہ سرب ہیں یا روم کے جلاد سپاہی
انساں ہیں کہ صحرا میں شبِ تار کی وحشت
آدم ہیں کہ ابلیس کے چہرے کی سیاہی

غرناطہ و بغداد میں پہلے بھی، مسلماں
دیکھی ہے یہی جرمِ ضعیفی کی مکافات

افلاک بھی سنتے نہیں بے ہمتِ مرداں
ہو ضربِ کلیمی تو اتر سکتی ہیں آیات

اس دور میں ہمت کی بنا علم و ہنر ہے
یہ ورنہ تری خاک میں پوشیدہ شرر ہے

یورش اعظمی

مرقد شبلی پر

تربتِ شبلی سے یوں آج کیا میں نے کلام
ہے عجب حال کہ ملت کا نہیں کوئی امام
ہر مسافر رہِ اخلاص و وفا چھوڑ گیا
ہے کہاں تجھ سا مجدد کہ بدل دے جو نظام
خانقاہوں سے بزرگوں کی صدائیں آئیں
مسجدوں سے ہوئیں رخصت وہ روایاتِ عظام
روحِ شبلی سے صدا آئی کہ اے میرے عزیز
زنگ آلود ہیں شمشیر ضمیر و اقلام

میں وہیں اشک پھر آنکھوں میں لیے بیٹھا رہا
دل تڑپتا رہا آنکھوں سے لہو بہتا رہا
ہائے وہ شبلیِ مغفور کہ اپنے پیچھے
کاروانوں کے لیے راہ و نشاں چھوڑ گیا
جس نے تاریخ و ادب، فلسفہ و علم کلام
حل کیے معنیِ پیچیدہ کے اسرارِ نہاں

فکر و تحقیق میں جس کا نہیں ثانی کوئی
شہ سواروں نے بہت سر کیے گرچہ میداں
جس کے خامہ میں عجب شان دلآویزی تھی
ایک اک لفظ میں اسرار معانی پنہاں
جس کے افکار میں اک ولولہ انگیزی تھی
چند لمحوں میں سمٹ آئی ہوں جیسے صدیاں

ایک خورشید کے مانند جو آیا ہے نظر
جس نے تاریخ کے چہرے کے نکھارے ہیں نقوش
توڑ کر کہنہ نظاموں کے سبھی پیمانے
کی ہے ایجاد وہ مئے جس میں کہ ہے جوش و خروش

کاسنی دھوپ اتر آئی ہو جیسے مجھ میں
چاندنی رات ہو جیسے کہ گلستانوں میں
سرمئی شام، خیالوں کی دھنک دور تلک
جیسے روشن ہو شفق رنگ شبستانوں میں
جیسے تکبیرِ خداوندِ جہاں گونج اٹھے
عرصۂ دہر کے ویران اذاں خانوں میں
آج بھی اس کی دعاؤں کا اثر باقی ہے
تھک گئے پاؤں مگر شوقِ سفر باقی ہے
بجھ گئی آگ مگر سوز جگر باقی ہے
رات باقی ہے ابھی نورِ سحر باقی ہے

ذہن تاریخ کے اوراق الٹتا ہی رہا
اور دل، مرقد شبلی پہ دھڑکتا ہی رہا
تربتِ شبلی پہ اک آہ بھری، لوٹ آیا
درد دل میں لیے انکھوں میں نمی لوٹ آیا
ہائے یورش کوئی شبلی کبھی پیدا ہو گا
علم و فن کا کوئی ایسا کبھی شیدا ہو گا

گفتگو: محمد حسن الیاس
سوالات: نجم سہر وردی
تدوین و ترتیب: رانا معظم صفدر

پاکستان، امریکہ اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ

جناب محمد حسن الیاس سے ایک انٹرویو

(4)

[”غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، امریکہ“ کے ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ کمیونیکیشن اور ”اشراق امریکہ“ (آڈیو) کے مدیر محمد حسن الیاس صاحب گذشتہ دنوں پاکستان گئے تو ”آف دا اسکول“ پوڈکاسٹ کے میزبان نجم سہر وردی نے اُن کا ایک تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اِس انٹرویو میں اُن سے پاکستان اور مسلمانوں کو درپیش مختلف مسائل پر سوالات کیے گئے۔ حسن الیاس صاحب نے اُن کے جواب میں پوری وضاحت سے اپنے موقف کو پیش کیا۔ یہ انٹرویو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اِسے ضروری ترتیب و تدوین اور حک و اضافے کے بعد ”اشراق امریکہ“ کے قارئین کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔]

مغرب اور ہمارا رویہ

سوال: فکرِ غامدی پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ آپ لوگ مذہب کو لے کر معذرت خواہانہ جگہ سے بات کرتے ہیں، جب کہ ہمارا مذہب سچا ہے اور اس نے ہمیں ہر طرح کے معاملات میں رہنمائی دی ہے، تو پھر ہمیں رہنمائی دینے کے بجاے معذرت خواہانہ جگہ پر کھڑے ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

کیا آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم شکست خوردہ قوم ہیں، عالمی طاقتوں سے ہار گئے ہیں، لہٰذا جو دنیا کا بنایا ہوا ورلڈ آرڈر ہے، اسی کے اندر ایڈجسٹ ہو جائیں، اور اگر کہیں تھوڑی بہت گنجایش ملے تو دین کی بات بھی کہہ لیں، باقی جیسے تیسے ہو سکے وقت گزار لیں، جب کہ ہمارا دین الہامی ہے، ہمارا پیغام سچا ہے تو ہمیں عالمی طاقتوں سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ پر اعتراض کرنے والے لوگ اس حوالے سے علامہ اقبال کا حوالہ دیتے ہیں:

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اور ان معترضین کا یہ بھی اصرار ہے کہ:

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

جواب: آپ کے سوال کے دو حصے ہیں: پہلا حصہ ہم کیا سوچتے اور کیا کرتے ہیں، اس کی وضاحت میں بعد میں کرتا ہوں۔ دوسرا حصہ ان لوگوں کے بارے میں جو عالمی طاقتوں کے حوالے سے ایک خاص نظریہ رکھتے ہیں، جو آپ نے سوال میں بیان کیا۔ اس میں آپ دیکھیے کہ ایک طرف وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ 'خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی' اور پھر کاسۂ گدائی لے کر بھیک مانگنے ان کے در پر چلے جاتے ہیں، جس کی بنیاد پر ہمارے ملک کی معیشت کا پہیہ چلتا ہے۔ اسی طرح، اِس نظریے کو ماننے والے لوگ اُنھی ملکوں کی ٹیکنالوجی کو استعمال کر کے، اُنھی کے ایجاد کردہ کیمرے اور اُن کے پوڈکاسٹ مائک کے سامنے بیٹھ کر لوگوں کے دلوں میں عالمی استعمار اور مغربی طاقتوں کے خلاف باتیں سناتے ہیں، اور اُنھیں کامیاب انقلاب کی نوید سناتے ہیں۔ اگر

وہ اپنے نظریے کی سچائی پر کامل یقین رکھتے ہیں تو انھیں یہ چاہیے کہ وہ ان ملکوں کی چیزوں پر انحصار کرنے کے بجاے اپنی بنیاد پر کھڑے ہوں، پتھر کے دور میں لوٹ جائیں اور وہاں سے Do and Die والی صورت حال بنا کر انقلاب لائیں۔

اس میں جو سمجھنے کی بات ہے، وہ یہ ہے کہ یہ تہذیبوں کی جنگ ہے۔ اور تہذیبوں کی جنگ ٹھنڈے کمروں میں بیٹھ کر نہیں لڑی جاتی۔ اس کے لیے پھر پہاڑوں پر جا کر لڑنا پڑے گا، جیسے طالبان نے لڑی۔ —— جس کے بارے میں، میں ہمیشہ یہی کہتا ہوں کہ ان کی عقل پر ماتم اور جذبے پر رشک آتا ہے۔ —— انھوں نے جو کہا، وہ اس پر عمل درآمد تو کرتے ہیں، جب کہ ہمارے لوگ یہاں محض کہانیاں سنا کر، غیر حقیقی اور جذباتی باتیں کر کے قوم کو بے وقوف بناتے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اِن لوگوں نے قوم کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔ یہ محض ایک تجزیہ نہیں ہے، بلکہ حقیقت کی دنیا میں اسے دیکھا جا سکتا ہے کہ ہماری قوم آج کہاں کھڑی ہوئی ہے۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں ہمارے لوگ جو اس سے متاثر ہو رہے ہیں، انھیں جو نقصان پہنچ رہا ہے، وہ جس حال میں زندگی بسر کر رہے ہیں، وہ سب کے سامنے ہیں۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ انھیں حالات کی سنگینی کا اندازہ ہونے سے پہلے انھیں اس جگہ پہنچا دیا ہے کہ وہ بے چارے ان حالات کو اللہ کی طرف سے آزمایش سمجھ رہے ہیں، حالاں کہ یہ حالات ان تخریب کاروں کی کارستانی ہے، جب کہ ہمارے لوگ بے چارے اپنے پورے اخلاص کے ساتھ ان حالات کو سہ رہے ہیں، اور بدلے میں عالمی طاقتوں سے نفرت کر رہے ہیں۔

آپ دیکھیے، کس طرح ایک بیانیہ بنایا گیا، پھر اس بیانیے کو پوری سوسائٹی میں گلی، محلے کی سطح تک پہنچایا گیا، اور ایک پود تیار ہوئی، پھر اس کو عالمی استعمار سے نفرت سکھائی گئی۔ نتیجہ کیا نکلا؟ ہماری ترقی ہوئی یا مزید حالات دگرگوں ہوئے۔ یہاں سوال بنتا ہے کہ کہاں ہے عظمت رفتہ کی باز یافت؟ مجھے یاد ہے، جب 11/ ستمبر کا واقعہ ہوا تو اس وقت ہمارے ''دانش وروں'' اور ''مذہبی طبقوں'' کی خوشی دیدنی تھی۔ کیسے تفاخر سے کہتے تھے کہ یہ ہمارا خواب تھا جو شرمندۂ تعبیر ہوا، بس اب دیکھیں امریکہ کہاں جاتا ہے اور ہم کہاں۔ اور آج دیکھ لیں، وہ کہاں ہے اور ہم آج بھی باج گزاری میں زندگی گزار رہے ہیں۔

جہاں تک آپ کے سوال کے پہلے حصے کا تعلق ہے، اس میں مختصر تفصیل کر دیتا ہوں۔

ہمارے نزدیک اہم بات یہ ہے کہ اسلام کیا کہتا ہے۔ ہم اللہ کو مانتے ہیں اور اس کے پیغمبر کو مانتے ہیں۔ اس کے بعد دنیا کے اندر جتنے بھی نظریات ہیں، چاہے وہ مسلم تہذیبی روایت نے پیدا کیے ہوں؛ چاہے وہ نظریات محرومی کی نفسیات سے پیدا ہوئے ہوں؛ چاہے وہ نظریات عظمتِ رفتہ کی بازیافت میں ہوں، ہمارے لیے ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ ہم سر تسلیم خم کرتے ہیں تو صرف اللہ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے۔ ہمارا یہ ماننا ہے کہ خدا کا پیغمبر، اس کا منتخب فرستادہ روے زمین پر اس کے دین کا تنہا ماخذ ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ دین کے بارے میں جو بھی بات ہوگی، اس کی سند محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آئے گی۔ ہمارا پورا دینی ڈسکورس اس Conservatism پہ کھڑا ہوا ہے۔ ہم خارج، سماج، معاشرہ، افادیت، عدم افادیت، تعمیر، تخریب، ان سب سے ماوراء ہیں۔ ہماری غرض صرف ان sources سے ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ہمیں ملے ہیں۔

باقی رہی بات کہ ہمارا انداز معذرت خواہانہ ہے۔ 'من تشبہ بقوم فھو منہ' کی مثال سے میں آپ کو واضح کرتا ہوں کہ لوگ کیسے دلیل کے جواب میں دلیل دینے کے بجاے نتیجہ اخذ کر کے اس کی تشہیر کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں لوگوں کا ماننا ہے کہ اسلام ہمیں مغرب کے انداز اپنانے کے بجاے اس کی مخالفت کا کہتا ہے۔ اور اس میں وہ رسول اللہ کا قول نقل کرتے ہیں: 'من تشبہ بقوم فھو منہ'، ''جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی، وہ انھی میں سے ہے۔'' اس پر ہمارا کہنا یہ ہے کہ کلام چونکہ اپنا context رکھتا ہے، اس کے لیے اس کی تفہیم کے لیے ہمیں اسے دیکھنا چاہیے۔ اب اس مکمل حدیث کو دیکھیے: 'بعثت بین یدی الساعۃ بالسیف، حتی یعبد اللہ وحدہ، لا شریك لہ، وجعل رزقی تحت ظل رمحی، وجعل الذل والصغار علی من خالف أمری، ومن تشبہ بقوم فھو منھم'، ''اللہ نے قیامت تک مجھے تلوار دی ہے، حتیٰ کہ اکیلے اللہ کی عبادت ہونے لگے جس کا کوئی شریک نہیں اور میرا رزق میری تلوار کے سایے میں رکھا گیا ہے اور ذلت و رسوائی اس کا مقدر بنائی گئی ہے جو میرے طریقہ کی مخالفت کرے، اور جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی، وہ انھی میں سے ہے'' (شعب الایمان، رقم 1199)۔

اس میں رسولوں کا خاص قانون ''اتمام حجت'' بیان ہوا ہے۔ اسی تناظر میں بات ہے، اللہ کہہ رہا ہے کہ تلواروں کے سایے میں تمھارا رزق رکھ دیا ہے، جو تمھاری مخالفت کرے گا، نیست و

نابود ہو گا۔ چنانچہ اب خدا کے عذاب کا موقع آ گیا ہے۔ جس نے جس قوم کے ساتھ ہونا ہے، الگ الگ ہو جاؤ، کیونکہ فیصلہ ہونے والا ہے۔

اب اس پر دلیل دینے کے بجائے آپ مجھے کہہ سکتے ہیں کہ آپ تو اصل میں Apologetic ہو گئے ہیں۔ حدیث کے واضح حکم کے ہوتے ہوئے مغرب کو رد کرنے کے بجائے ان کے ساتھ ہو گئے ہیں۔ تو پھر میں پلٹ کے یہ کہوں گا کہ آپ اصل میں Islamism، اپنی سیاسی برتری کی بازیافت میں دین کے جو بنیادی مقدمات ہیں، ان کو براہ راست سمجھنے پر بھی آمادہ نہیں ہیں، آپ کا معاملہ دین سے دوری ہے، نہ کہ ہمارا معاملہ apology کا ہے۔

[باقی]

شاہد محمود

خبر نامہ ”المورد امریکہ“

[ستمبر 2024ء]

غامدی سینٹر میں ممتاز دینی اسکالرز کی گیلری کا قیام

غامدی سینٹر میں ممتاز دینی اسکالرز کی ایک گیلری کا قیام عمل میں لایا گیا ہے، جس میں دنیا کے معروف دینی اسکالرز کی تصاویر اور خاکے آویزاں کیے گئے ہیں۔ اس گیلری کا مقصد نئی نسل کا ان بزرگوں کے ساتھ ایک محسوس تعلق قائم کرنا اور اس بات کو نمایاں کرنا ہے کہ غامدی سینٹر کسی مسلک یا کسی فرقے کے فروغ کا ادارہ نہیں، بلکہ اس کا مقصد خالص علمی روایت کو پروان چڑھانا ہے۔

”قرآن و سنت کا باہمی تعلق“ کی آڈیو بک

یہ عمار خان ناصر صاحب کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب اصول فقہ کی اس اہم ترین بحث کا ایک تاریخی مطالعہ پیش کرتی ہے کہ قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے باہمی تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ اس کتاب میں فقہاے صحابہ کے رجحانات سے لے کر مکتب فراہی تک سامنے آنے والے بنیادی اصولی مواقف کا مبسوط جائزہ لیتے ہوئے تطبیقی مثالیں بھی تفصیلاً پیش کی گئی ہیں۔ اس کتاب کی آڈیو ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر سلسلہ وار نشر کی جا رہی ہے۔ اب تک اس کی 6 اقساط نشر ہو چکی ہیں، جن کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز کی انگریزی زبان میں ڈبنگ

23 اعتراضات کی اس ویڈیو سیریز میں غامدی صاحب کے افکار پر روایتی مذہبی فکر کی طرف سے کیے گئے اعتراضات اور تنقیدات کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ اب تک اس سیریز کی 172 نشستیں نشر ہو چکی ہیں۔ غامدی سینٹر کی جانب سے ان تمام نشستوں کو AI کی مدد سے انگریزی زبان میں ڈب کر کے ادارے کے یوٹیوب چینل پر سلسلہ وار نشر کیا جا رہا ہے تاکہ انگریزی جاننے والے اس قیمتی علمی ذخیرے سے مستفید ہو سکیں۔

''اجماع''

23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز میں ''حدیث کیا ہے؟'' کے بعد ''اجماع'' کے موضوع کا آغاز کیا گیا ہے۔ گذشتہ ماہ اس موضوع کے تحت ہونے والے پروگراموں میں سورۂ شوریٰ (44) کی آیت 38 'اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ' کی روشنی میں یہ بتایا گیا کہ اگر اکثریت اجتماعی معاملات سے متعلق کوئی فیصلہ کر دیتی ہے یا ان معاملات میں اجماع ہو جاتا ہے تو وہ کیوں واجب العمل ہو جاتا ہے اور اس بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کیا ہیں۔ مزید برآں، التزام جماعت کی تعبیر پر روشنی ڈالی گئی۔ ان پروگراموں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

''پاکستان قومی ریاست یا مذہبی ریاست: غامدی صاحب کا موقف''

سید منظور الحسن نے اپنے اس مضمون میں ریاستِ پاکستان کے حوالے سے غامدی صاحب کے موقف کو بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ پاکستان نہ کوئی مذہبی ریاست ہے اور نہ ہی کسی گروہ یا فرد کی مقبوضہ ریاست ہے، جس میں بادشاہ یا حکمران کا مذہب ہی ریاست کا مذہب قرار پاتا ہے، بلکہ یہ جدید دور کی قومی ریاست ہے، جو بین الاقوامی معاہدوں کی بنا پر قائم ہوتی ہے اور جس میں قومیت کی اساس رنگ و نسل اور نظریہ و مذہب کے بجاے ملک ہوتا ہے۔ یہ مضمون ''اشراق'' امریکہ کے گذشتہ ماہ کے شمارے میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

"Islam and the State: Traditional Narrative"

غامدی صاحب نے 2015ء میں "اسلام اور ریاست: ایک جوابی بیانیہ" کے عنوان سے ایک شہرۂ آفاق مضمون لکھا تھا۔ اس پروگرام میں ڈاکٹر عدنان ذوالفقار غامدی صاحب کے اس مضمون کا خلاصہ انگریزی زبان میں سلسلہ وار پیش کر رہے ہیں تاکہ انگریزی سمجھنے والے بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ گذشتہ ماہ اس موضوع پر ایک لیکچر نشر کیا گیا، جس کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جا سکتا ہے۔

غامدی صاحب کی ہفتہ وار سوال و جواب کی نشستیں

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام ہر ہفتے سوال و جواب کی لائیو نشست منعقد کی جاتی ہے، جس میں حسن الیاس صاحب غامدی سینٹر کو موصول ہونے والے مختلف نوعیت کے سوال غامدی صاحب کے سامنے رکھتے ہیں اور غامدی صاحب ان کا جواب دیتے ہیں۔ اگست 2024ء میں ان نشستوں میں زیر بحث آنے والے اہم موضوعات یہ ہیں: "حدیث کساء کی کیا حقیقت ہے؟"، "اہل بیت کون ہیں؟" اور "بنگلہ دیش میں تبدیلی"۔ سوال و جواب کی ان نشستوں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

"تفہیم الآثار" ایک تعارف

عمار خان ناصر صاحب کا یہ مضمون اردو زبان میں صحابہ و تابعین کے آثار کی تدوین و ترتیب اور شرح و وضاحت پر مبنی ان کے تصنیفی منصوبے "تفہیم الآثار" کا تعارف ہے۔ صحابہ و تابعین کے آثار کی جمع و تدوین، ان کی دینی و علمی اہمیت بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اردو زبان میں صحابہ و تابعین کے آثار کی ترتیب و تدوین اور شرح و وضاحت پر مبنی کوئی مستقل تصنیفی کام موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ تحقیق و تخریج کے جدید وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے اس نوعیت کا ایک جامع مجموعہ مرتب کیا جائے۔ اس مضمون کو "اشراق" امریکہ کے گذشتہ ماہ کے شمارے میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

ہفتہ وار درسِ قرآن و حدیث

اگست 2024ء میں غامدی سینٹر کے زیر اہتمام جناب جاوید احمد غامدی کے لائیو درسِ قرآن و حدیث کی نشستوں میں غامدی صاحب نے سورۂ کہف کی 56 تا 87 آیات کا درس دیا، جب کہ درس حدیث کی نشستوں میں عذاب قبر سے متعلق جن سوالوں کو زیر بحث لایا گیا، وہ یہ ہیں: ''کیا سعد بن معاذ کو عذاب قبر کا سامنا ہوا؟''، ''کیا بچوں کو قبر کا عذاب ہوتا ہے؟'' اور ''کیا پیٹ کی بیماری سے فوت ہونے والے کو قبر کا عذاب ہو گا؟'' قرآن و حدیث کے دروس کی یہ نشستیں غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

''تفہیم الآثار'' پروجیکٹ

غامدی سنٹر کے زیر اہتمام ''تفہیم الآثار'' کے عنوان سے نشر ہونے والے پروگرام میں صحابہ و تابعین کے آثار کی شرح و وضاحت اور منتخب آثار پر مبنی سوال و جواب کی نشستیں ریکارڈ کی جا رہی ہیں۔ اس پروگرام کی میزبانی کے فرائض ڈاکٹر سید مطیع الرحمٰن سرانجام دے رہے ہیں، جب کہ ڈاکٹر عمار خان ناصر اس میں بہ طورِ مہمان شریک ہیں۔ گذشتہ ماہ کے پروگراموں میں صحابۂ کرام کی تنقیص اور ان پر سب و شتم کا جو رویہ پیدا ہو گیا تھا، اس پر صحابۂ کرام کے رد عمل کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ مزید برآں، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے آثار کی روشنی میں یہ بات بھی زیر بحث رہی کہ صحابۂ کرام کے علم و عمل کو اسوہ کی حیثیت کیسے اور کیوں حاصل ہے۔ ان پروگراموں کو ادارے کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

Ask Ghamidi

یہ سوال و جواب کی آن لائن نشست ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنے ذہنوں میں اٹھنے والے دینی اور اخلاقی موضوعات سے متعلق مختلف سوالوں کے جوابات براہ راست غامدی صاحب سے حاصل کر سکیں۔ ہر ماہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس نشست میں حصہ لیتی۔ اگست 2024ء میں اس نشست میں لوگوں کی طرف سے پوچھے جانے والے چند اہم سوالات یہ ہیں:

''کیا قرآن مجید میں بلیک ہول کا ذکر ہے؟''، ''لفظ کفر کے معنی کیا ہیں؟'' اور ''کیا تصوف اور اسلام میں روحانیت حاصل کرنے کے لیے کچھ مشترکہ چیزیں موجود ہیں؟''۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

''مطالعۂ سیرت'' کی آڈیو ریکارڈنگ

یہ کتاب مولانا وحید الدین خان کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر خالد ظہیر نے اسے اپنی آواز میں ریکارڈ کرایا ہے، جسے غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر سلسلہ وار نشر کیا جا رہا ہے۔ اب تک اس کی 11 اقساط نشر ہو چکی ہیں، جن کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جا سکتا ہے۔

''علم و حکمت: غامدی کے ساتھ''

اگست 2024ء میں دنیا نیوز چینل پر نشر ہونے والے پروگرام ''علم و حکمت: غامدی کے ساتھ'' میں جن موضوعات پر گفتگو کی گئی، وہ یہ ہیں: ''جدیدیت کا چیلنج اور مذہبی فکر''، ''تصور نظم قرآن پر اعتراضات کا جائزہ''، ''انسانی فطرت اور مذہبی روایت'' اور ''سوال و جواب''۔ ان پروگراموں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

''اسلام اسٹڈی سرکل''

اگست 2024ء میں شہزاد سلیم صاحب نے ''اسلام اسٹڈی سرکل'' پروگرام میں قرآن مجید، حدیث اور بائیبل کے جن موضوعات پر بات کی، ان کے عنوانات بالترتیب یہ ہیں: ''الہامی کتابوں کا مقصد''، ''دوسروں کے عیب چھپانا'' اور ''جو سکھاؤ اس پر عمل کرو''۔ مزید برآں، سیشن کے آخر میں عاجزی کے حوالے سے بھی گفتگو کی گئی اور سوالوں کے جواب دیے گئے۔ اس کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

''حیات امین''

نعیم احمد بلوچ صاحب نے ''حیات امین'' کی گذشتہ ماہ شائع ہونے والی قسط میں مولانا اصلاحی

کے مدرسۃ الاصلاح کو چھوڑ کر پٹھان کوٹ جانے کے اسباب بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے درمیان کن معاملات میں اتفاق اور کن میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ لکھتے ہیں کہ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی میں ایک قدر مشترک یہ تھی کہ دونوں ہی تقلید سے آزاد تھے اور دونوں کے سوچنے کے انداز میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ یہ مضمون ''اشراق'' امریکہ کے گذشتہ ماہ کے شمارے میں پڑھا جا سکتا ہے۔

''میزان'' کی انگریزی زبان میں تدریس

گذشتہ ماہ شہزاد سلیم صاحب نے غامدی صاحب کی کتاب ''میزان'' میں سے جن موضوعات پر انگریزی زبان میں لیکچرز ریکارڈ کرائے، وہ یہ ہیں: ''جہاد کا حکم''، ''نصرت الٰہی، جنگی قیدی اور مال غنیمت''، ''جمع قرآن کی تاریخ''، ''انسانیت'' اور ''کامیاب شادی''۔ ان لیکچرز کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جا سکتا ہے۔

''دین کا بنیادی اصول''

ریحان احمد یوسفی صاحب نے اپنے اس مضمون میں دینی احکام پر عمل پیرا ہونے کے حوالے سے ایک بنیادی اصول بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ دینی احکام میں بنیادی اصول یہ ہے کہ جو کہا جائے، وہ کیا جائے اور جیسے کہا جائے، ویسے ہی اور اتنا ہی کام کیا جائے۔ تبدیلی یا اضافے کا مطلب خود کو دھوکا دینا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ لوگ بہت نیک نیتی کے ساتھ دین میں اضافے اور تبدیلی کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ایمانیات اور عبادات میں اجتہاد نہیں ہو سکتا۔ یہی دین کا بنیادی اصول ہے۔ قارئین اس مضمون کو ''اشراق'' امریکہ کے اگست 2024ء کے شمارے میں دیکھ سکتے ہیں۔

''البیان'' کی انگریزی زبان میں تدریس

شہزاد سلیم صاحب غامدی صاحب کی تفسیرِ قرآن ''البیان'' کی انگریزی زبان میں تدریس کا

فریضہ سر انجام دے رہے ہیں۔ اگست 2024ء میں انھوں نے ان نشستوں میں سورۂ آل عمران کی آیات 104 تا 130 پر بات کی۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

غامدی سینٹر کے آن لائن تعلیمی کورسز

اگست 2024ء میں غامدی سینٹر نے اپنے آن لائن لرننگ پلیٹ فارمز Udemy اور Teachable کے لیے انگریزی زبان میں تین کورسز شائع کیے، جن کے نام یہ ہیں: "Understanding Divorce Law of Islam"، "Belief in Angels and Divine Books" اور "The Framework of Islam"۔ پہلے دو کورسز صرف Teachable پر، جب کہ تیسرا کورس Teachable اور Udemy، دونوں پلیٹ فارمز پر موجود ہے۔ ان کورسز کو شہزاد سلیم صاحب نے مرتب کیا ہے۔ واضح رہے کہ غامدی سنٹر کے آن لائن کورسز کو منفرد اور دل چسپ بنانے کے لیے ویڈیوز کو جدید انداز میں ایڈٹ کیا جاتا ہے۔ یہ کورسز غامدی سینٹر کی Teachable ویب سائٹ اور Udemy پر دستیاب ہیں۔

Ask Dr. Shehzad Saleem

یہ سوال و جواب کی لائیو ماہانہ نشست ہے، جس میں شہزاد سلیم صاحب لوگوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے مختلف دینی، اخلاقی اور معاشرتی موضوعات سے متعلق سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ اس نشست میں لوگ اردو اور انگریزی، دونوں زبانوں میں اپنے سوال پوچھ سکتے ہیں۔

دینی آرا پر مبنی فتاویٰ کا اجرا

شریعت کے قانونی اطلاقات کے حوالے سے لوگ اکثر غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، امریکہ سے رابطہ کرتے ہیں۔ انھیں نکاح و طلاق، وراثت (inheritance) اور بعض دیگر معاشی اور معاشرتی پہلوؤں سے اطلاقی آرا کی ضرورت ہوتی ہے۔ گذشتہ ماہ اسی نوعیت کی مختلف

ضرورتوں کے تحت 5 فتوے جاری کیے گئے۔ انھیں جناب جاوید احمد غامدی کی رہنمائی میں حسن الیاس صاحب نے جاری کیا۔

شہزاد سلیم صاحب کے آن لائن نجی مشاورتی سیشن

شہزاد سلیم صاحب ہر ماہ لوگوں سے آن لائن نجی مشاورتی سیشن کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان سیشنز میں لوگ اپنے مختلف ذاتی اور خاندانی نوعیت کے مسائل میں شہزاد سلیم صاحب سے مشاورت کرتے ہیں۔ گذشتہ ماہ اس سلسلے کے 30 سے زائد سیشنز ہوئے۔ ان سیشنز میں لوگوں نے شہزاد سلیم صاحب سے والدین کو درپیش مشکلات اور نوعمری اور ازدواجی مسائل کے حل کے لیے مشاورت کی۔

مولانا وحید الدین خاں پر ڈاکومینٹری کی انگریزی زبان میں ڈبنگ

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام دورِ حاضر کے جید عالم دین مولانا وحید الدین خان کی زندگی پر اردو زبان میں ایک ڈاکومینٹری بنائی جا رہی ہے۔ اس ڈاکومینٹری میں مولانا وحید الدین خان کے علمی، فکری، تحقیقی اور دعوتی سفر کے علاوہ ان کے خاندانی پس منظر سے لے کر ان کی دعوت کی آخری سعی تک کے تمام مراحل کو پیش کیا جا رہا ہے۔ اس ڈاکومینٹری کو اب AI کی مدد سے انگریزی زبان میں ڈب کر کے ادارے کے یوٹیوب چینل پر سلسلہ وار نشر کیا جا رہا ہے۔

23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز کا انگریزی زبان میں خلاصہ

شہزاد سلیم صاحب 23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز میں اب تک کے زیر بحث آنے والے تمام موضوعات کا انگریزی زبان میں خلاصہ بیان کر رہے ہیں۔ گذشتہ ماہ شہزاد سلیم صاحب نے 23 اعتراضات کی سیریز میں زیر بحث آنے والے موضوع ''حجاب'' کا خلاصہ بیان کیا۔ ان پروگرامز کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔